ماہنامہ
نقیبِ ختمِ نبوت
ملتان

صفر المظفر ۱۴۱۳ھ
اگست ۱۹۹۲ء

پاکستان کے راہنماؤ ...؟

اگر پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت بنا دیا گیا تو یاد رکھو اسلامی سلطنت میں کوئی انسان دکھی نہ ہوگا۔ یہ سلطنت غیور اور بہادر مجاہدوں اور درویشوں کی بستی ہوگی، کوئی دشمنِ اسلام، پاکستان کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرات نہ کر سکے گا۔ اسلامی پاکستان کے اندر مسائل اگر ہوں گے تو خود بخود ختم ہو جائیں گے اور مستقبل بھی پریشان کن نہ ہوگا۔

خدا یقیناً نیک نیتوں کی مدد کرتا ہے۔ بہتان طرازی سے پرہیز کرنا ورنہ خدا کے آگے جواب دہ ہو گے۔ عزت، ذلت، موت، حیات سب اللہ کے پاس ہیں۔ شیطان کو شکست دو اور اللہ کے فوجی بن جاؤ۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ جھوٹے مزے یا جھوٹے وعدے کرسئ اقتدار کیلئے مت کرنا۔ کرسئ اقتدار ایک بہت ہی بے وفا محبوبہ ہے مسکرا مسکرا کر ایسے انداز میں جھوٹ بولنے والے خوشامدی جو سچے دکھائی دیں، ہمیشہ جھوٹے اور خود غرض ہوتے ہیں۔ خدا ان سے پاکستان کو محفوظ رکھے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ
نواب افتخار حسین خان ممدوٹ سے گفتگو
۱۹۵۰ء ملتان

افکارِ احرار

اِس پیکرِ علم و عمل کو جانتے ہو...؟

وہی جِس کے ہاتھ پر حجّتُ الاسلام علاّمہ مُحمّد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے سب سے اوّل بیعت کی۔

وہی جِس کے ہاتھ میں پانچ سو عُلماء نے مجمع عام میں ہاتھ دے دیئے۔

وہی جو چالیس برس کی عُمر میں پانچ دفعہ حکومت کے عتاب کا شکار ہو چکا ہے۔

وہی جو برسوں جیل کی کالی کوٹھڑیوں میں زندگی کی بہاریں لُٹا چکا ہے۔

ہندوستان کی چالیس کروڑ کی آبادی میں

جس کی ٹکر کا ایک آدمی نہیں۔

اِس جیسا خُوش بیاں نہیں۔

اِس جیسا جادو بیاں نہیں۔

جس کے ایک ایک لفظ پر ہر مجمع میں ہزاروں آدمی آمادۂ عمل ہو جاتے ہیں۔

یہ ہیں امیرِ شریعت سیّد عطاءُ اللہ شاہ بُخاریؒ

مفکرِ احرار:

چودھری افضل حق رحمہُ اللہ

اقتباس اداریہ روزنامہ "مجاھد" لاہور

۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ء

ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوّت ملتان

صفر المظفر ۱۴۱۳ھ اگست ۱۹۹۲ء جلد ۳ شمارہ ۸ قیمت فی پرچہ =/۶ روپے

سرپرست اکابر

حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہٗ

حضرت مولانا محمد اسحٰق صدیقی مدظلہٗ

مجلس ادارت

رئیس التحریر:

سیّد عطاء المحسن بخاری

مدیر مسئول:

سید محمد کفیل بخاری

رفقاءِ فکر

مولانا محمد عبدالحق مدظلہٗ

حکیم محمود احمد ظفر مدظلہٗ

ذوالکفل بخاری ● قمر الحسنین

خادم حسین ● ابوسفیان تائب

محمد عمر فاروق ● عبداللطیف خالد

حُر آغائی ● دیدہ ور۔

زرِ تعاون سالانہ

◎ اندرونِ ملک =/۶۰ روپے ◎ بیرونِ ملک =/۵۰۰ روپے پاکستانی

رابطہ

خط و کتابت: دارِ بنی ھاشم — مہربان کالونی — ملتان — فون ۷۲۸۱۳

ترجمان تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوۃ شعبۂ تبلیغ عالمی مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان

ناشر: سید محمد کفیل بخاری طابع: تشکیل احمد اختر مطبع: تشکیل نور پرنٹرز مقام اشاعت: دارِ بنی ہاشم ملتان

آئینہ

دل کی بات	مدیر	۳
حضرت مولانا عبدالعزیز رائے پوری رحمہ اللہ	ادارہ	۵
شاہ جی اور قافلۂ احرار	مولوی محمد سعید مرحوم	۹
معجز بیان سحر اللسان	مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ	۱۸
امیر شریعتؒ ۔ زندگی کی ایک موج تند جولاں	پروفیسر تاثیر وجدان	۱۹
سحر البیان خطیب	میاں محمد شفیع	۲۴
سپاہی بھی سپہ سالار بھی	شاہ محمد عثمانی	۲۶
حضرت امیر شریعتؒ مولانا عبدالرحمٰن میانویؒ کی نظر میں۔	محمد حسن چغتائی مرحوم	۲۸
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ (نظم)	حفیظ جالندھری	۳۰
وہ جس کے فکر و عمل میں فرشتگی تھی اسیر	سید محمد قاسم نوری	۳۱
بر وصل امیر شریعت (نظم)	عطاء اللہ خان عطاء	۳۳
اقبال کے حضور میں	پروفیسر حکیم عنایت اللہ	۳۴
کھول کر آنکھیں میرے آئینہ گفتار میں	معاصر سے انتخاب	۳۶
تابعین کرام کی باتیں	ادارہ	۳۷
کشف سبائیت	مولانا ابوریحان سیالکوٹی	۳۸
آذر کون ۔ ؟	مفتی ابو معاویہ تونسوی	۴۷
زبان میری ہے بات ان کی	ساغر اقبالی	۵۶
واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر	مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی	۵۸
قومی ترانے :		
پاک سرزمین شاد باد	مجید لاہوری	۶۵
پاکستان ہمارا ہے	مجید لاہوریؒ	۶۶
لوٹ مار چھین شاد باد	حضرت عینک فریمی	۶۸
یوم آزادی	پروفیسر محمد اکرام تائب	۶۹
غزل	پروفیسر خالد شبیر	۷۱

دل کی بات

۱۴۔ اگست کو ہم پینتالیسواں جشن آزادی منا رہے ہیں۔ اگر پینتالیس سال کی الٹی زقند لگا کر تحریک پاکستان کو چشم تخیل سے دیکھیں تو ہر طرف "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کے فلک شگاف نعروں کی گونج اور گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ ہر سو ایک ہی شور بپا ہے کہ

"ہم مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کر کے دم لیں گے" ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ہماری قومیت، مذہب، سیاست و ثقافت اور معیشت غرض ہر چیز ان سے جدا ہے۔ ہم اپنی الگ پہچان اور شناخت رکھتے ہیں، مسلمان اب زیادہ دیر ہندوستان میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ہم ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں اسلام کی حکومت ہوگی اور اسلام ہی کے احکام کے مطابق فیصلے ہوں گے، ہر کسی کو بلاامتیاز رنگ و نسل انصاف ملے گا"۔

پھر کیا تھا! مسلمان اس آواز پر دیوانہ وار دوڑے نہ صرف دوڑے بلکہ شریک سفر ہوئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور منزل پر آ کر دم لیا۔ پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ مسلمانوں نے تقسیم کے مسئلہ پر آپس میں پیدا ہونے والی رنجشیں بھلا دیں اور سب نے مل کر مملکت خداداد کی حفاظت اور ترقی و استحکام کے عہد و پیماں کئے۔

پھر یکایک ایسا حادثہ رونما ہوا کہ "منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے" قومی قیادت کے روپ میں ایسے لوگ نمودار ہوئے جو تحریک آزادی کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے۔ جنہیں اس صعوبت بھری جدوجہد میں خراش تک نہ آئی تھی انگریز کے پالتو اور آزیری حجر پاکستان کی کشتی کے کھیون ہار بن بیٹھے۔ چند مخصوص خاندانوں کو ہمیشہ کے لئے زمام اقتدار سونپ کر ملک و قوم کے ساتھ تاریخ کا بدترین مذاق کیا گیا۔ تحریک پاکستان میں پیش کئے گئے مقاصد سے عملی انحراف کیا گیا، لوٹ کھسوٹ کا چور بازار گرم کیا گیا اور اسلام کا نام نیر اسلام کو رسوا کیا گیا حتی کہ آدھے ملک سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اس سارے کئے دھرے کا سہرا پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کے سر ہے۔ وہ کونسا جور و ستم ہے جو وطن عزیز پر نہیں ڈھایا گیا۔ یہ داستان کرب اتنی طویل اور المناک ہے کہ

جو میں بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال اسی شرمناک ماضی کا عکس ہی تو ہے۔ اس وقت ملک تباہی کے کنارے پر نہیں بلکہ دلدل میں دھنس چکا ہے۔ سیاست مقصد نہیں تجارت بن چکی ہے، معاشی صورت حال ابتر ہے، دہشت گردی، قتل و غارت گری اور خوف و ہراس نے عام آدمی کا امن و سکون چھین لیا ہے۔ زندگی بے یقینی کی صورت حال سے دوچار ہے۔ حال ہی میں چنیوٹ میں قرآن پاک نذر آتش کئے گئے مگر بے حسی اور بے غیرتی کی انتہا یہ ہے کہ "اک ہو کا عالم ہے" ابھی تک مجرم گرفتار نہیں ہوئے۔ پشاور میں محرم کے موقع پر سپاہیوں اور رافضیوں کے توسیع پسندانہ عزائم اور بداعمالیوں کے نتیجہ میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور کئی مسلمان خون میں نہا گئے۔ مجرم دندنا رہے ہیں مگر انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں جبکہ حکومت جانتی ہے کہ مجرم کون ہیں؟ ہمیں افسوس ہے کہ حکومت ان مسائل کا حل پیش کرنے یا پیش کیا گیا حل قبول کرنے کی بجائے ایک ہی رٹ لگا رہی ہے کہ "فرقہ واریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔" اور اس فرقہ واریت کا الزام ان لوگوں کے سر تھوپا جا رہا ہے جو وحدت امت کے عظیم مقصد کے

حامل ہیں۔

ہمارے اس داخلی انتشار نے عالمی طاقتوں کو بھی یہاں کھل کھیلنے کا خوب موقع فراہم کیا۔ گزشتہ دنوں آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ "عالمی طاقتیں پاکستان کی تشکیل نو چاہتی ہیں"

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ امریکہ ہمارے جغرافیہ، مذہب، سیاست، ثقافت، تعلیم اور نظام حکومت غرض ہر شے کو اپنے نظام کے تابع کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ نصف سے زائد کام مکمل کر چکا ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ امریکہ کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسے ہمارے ہاں سے ہی وافر تعداد میں "میر جعفر" مل جاتے ہیں۔ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کو ہی لیجئے جس نے گلگت اور دیگر شمالی علاقہ جات کو ایک علیحدہ انتظامی یونٹ بنانے کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ لوگ ایک عرصہ سے اس حساس علاقے پر اپنے ہم مسلک ایک ہمسایہ ملک کے اشارے پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور اس علاقے میں ایک اور شیعہ ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایران، افغانستان میں اور نئی شیعہ ریاست پاکستان میں آسانی کے ساتھ مداخلت کر سکے۔ اور ایرانی انقلاب برآمد کیا جا سکے۔ اس کے لئے انہیں امریکہ کا سہارا لینا پڑا تو قطعاً دریغ نہ کریں گے۔ کیونکہ ان عناصر کا ماضی اس پر خود شاہد عدل ہے۔

دوسری طرف پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن بے نظیر زرداری نے "نئے عمرانی معاہدے" (NEW SOCIAL CONTRACT) کا راگ الاپا ہے۔ اور وہ اس سلسلہ میں اپنے والد کے دیئے ہوئے آئین ۱۹۷۳ء کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار بیٹھی ہیں۔ اقتدار کی سیج کتنی بری شے ہے کہ جس آئین کے تحفظ کے لئے گیارہ برس لڑتی رہیں اب اسی کو ختم کرانے کی سعی میں مصروف ہیں۔ اس طرح سیاسی حوالے سے بھی امریکہ کو اطمینان حاصل ہے۔ جن لوگوں کی زبانیں یہ کہتی نہ تھکتی تھیں کہ "بری سے بری جمہوریت فوجی حکومت سے بہتر ہے" سب کے سب فوج کے حق میں رطب اللسان ہیں اب ہم انہی کی زبان سے سن رہے ہیں کہ باہمی اتفاق سے حکومت میں فوج کا مستقل سیاسی کردار متعین ہونا چاہیئے" پگاڑو لیگ فنکشنل ہو گئی ہے، جونیجو "اپنی لیگ" پر سوار ہیں اور سوار رہنے پر بضد ہیں، جماعت اسلامی کراچی میں اپنی ہی حریف ایم کیو ایم کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ نوابزادہ نصراللہ خان کی اے۔ پی۔ سی کا حال "سو جتنی نہ فروختنی" کے مصداق ہے۔

حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اقتدار چھن جانے کے خوف سے کم سے کم وقت میں سب کچھ سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ انہیں اس سے کچھ غرض نہیں کہ ملک کا کیا بنے گا اور قوم پر کیا بیتے گی؟

غرض داخلی و خارجی ہر سطح پر پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ پاکستان ہماری روح اور جسم ہے۔ ظاہر ہے اس کو تکلیف پہنچے گی تو ہم بھی درد محسوس کریں گے۔ جشن آزادی منانے کی بجائے ہمیں آزادی کی قدر کرتے ہوئے وطن عزیز کی بقاء و استحکام کی راہیں سوچنی چاہئیں۔ حکمران ہوش کے ناخن لیں، سیاست دان خوف خدا کریں اور علماء میدان میں نکل کر اپنا فرض ادا کریں۔ ایک دوسرے کے انتظار میں بیٹھے رہنا بھی قومی جرم ہے "غار میں کوئی نہیں چھپا ہوا جس کے ظہور کے آپ منتظر ہیں"۔ حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے بلا تمیز ہر دین دشمن اور وطن دشمن کا سر کچل دیں۔ تب جا کے کہیں آزادی کا سفر مکمل ہوگا۔

مولانا محمد عبداللہ بھکر

مرشدی مربی حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

مرشدی و مربی حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پُر ملال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر ہونا ممکن نہیں۔ آپ مُرشدِ احرار حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے صحیح جانشین تھے۔ آپ کی دعائیں ہمیشہ ہمارے شاملِ حال رہیں، آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت مولانا سعید احمد رائے پوری مدظلہٗ اب آپ کے جانشین ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے اور ان کے دم قدم سے حضرت اقدس رحمہ اللہ کی خانقاہ کو دائم آباد رکھے (آمین) ذیل میں معاصرِ عزیز "مناقب" کے شکریے کے ساتھ مولانا محمد عبداللہ (بھکر) کی تحریر ہدیۂ قارئین کی جارہی ہے۔ (ادارہ)

ہمارے مرشد و مربی حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رائے پوری ۲ جون کو دنیا سے سفر فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت اقدس قدس اللہ سرہ العزیز نے ۱۹۰۵ء میں گمتھلہ راؤ ضلع کرنال کے معروف راجپوت گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کے والد گرامی چودھری تصدق حسین خاں علاقہ کے بڑے زمیندار اور ذیلدار تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی تھیں۔ آپ نے اپنے گاؤں گمتھلہ میں قرآن مجید کا کچھ حصہ حفظ کیا تھا پھر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب آپ کو رائے پور لے آئے۔ خانقاہ کے پاکیزہ ماحول میں آپ کا بچپن گزرا۔ یہیں قرآن مجید مکمل کیا اور ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی۔ خود ہی منزل سنا کرتے اور پاس بٹھا کر سبق یاد کرایا کرتے تھے۔ خانقاہ رائے پور کو اللہ تعالیٰ نے خاص عظمت اور مرکزیت عطا فرمائی تھی۔ علما اور صلحا کا مرجع تھی۔ انگریزوں کے خلاف حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کی تحریک عروج پر تھی۔ حضرت شیخ الہند اکثر رائے پور تشریف لایا کرتے تھے اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سے تنہائی میں مشورے ہوتے تھے۔ جب حضرت شیخ الہند نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا اور ترکی حکمرانوں سے انگریزوں کے خلاف تعاون حاصل کرنے کے لئے خود حجاز مقدس تشریف لے گئے تو ہندوستان میں تحریک کی قیادت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے سپرد فرمائی تھی اور تحریک کے ذمہ دار اور راز دار لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی راہنمائی اور سرپرستی میں کام کریں۔ حضرت مولانا شاہ

عبدالعزیز صاحب نے یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور ان اکابر امت علماء اور مجاہدینِ آزادی کی زیارت و ملاقات سے سرفراز ہوا کرتے تھے۔ اس بابرکت اور سراپائے اخلاص جماعت کی عقیدت و محبت اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں اسی دور میں بھر دی تھی۔

درس گاہ رائے پور کا نصاب تعلیم پڑھ لینے کے بعد آپ کو مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں داخل کرایا گیا۔ اِس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور روحِ رواں حضرت فخر المحدثین مولانا خلیل احمد صاحب تھے جو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے پیر بھائی تھے۔ حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلفاء بہت تھے لیکن ان میں حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری رحمہم اللہ کی حیثیت نمایاں اور نرالی تھی۔ ان تینوں بزرگوں کو آپس میں بڑی محبت اور اختصاص تھا۔ اس تعلق کی وجہ سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے مولانا عبدالعزیز صاحب کو ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح عزیز سمجھا اور ان کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھا۔ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حافظہ اور ذہانت کی نعمتوں کے ساتھ علم کا شوق بھی عطا فرمایا تھا۔ اسباق میں پابندی سے شامل ہوتے اور اہم کتابوں کے اسباق میں اساتذہ کی تقاریر پوری کی پوری قلم بند فرمالیا کرتے تھے۔ درس نظامی کے تمام درجات میں آپ کی تعلیمی پوزیشن نمایاں اور امتیازی رہی۔ آپ ابھی پڑھ رہے تھے کہ ۱۹۱۹ء میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کا وصال ہوگیا اور ان کی جگہ خانقاہ رائے پور کی مسند پر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رونق افروز اور زینت افزا ہوئے۔ آپ نے بھی اپنے آپ کو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے حوالے کر دیا اور انھیں اپنے عظیم نانا کی طرح اپنا شیخ اور مربی ٹھہرایا۔ ۱۹۲۴ء میں دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ ہوئے تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے آپ کے متعلق حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سے فرمایا کہ "مولوی عبدالعزیز صاحب ذہین آدمی ہیں اور علمی استعداد بھی بلند ہے۔ انھیں مظاہر العلوم میں تدریس پر لگا دیا جائے۔" حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ "ضروری نہیں کہ تدریس میں لگ جانے کے بعد یہ اِدھر لوٹیں۔ ہم تو انھیں ادھر ہی (تصوف و تزکیۂ باطن پر) لگائیں گے۔"

آپ نے گھر کا آرام و راحت ترک کر کے خانقاہ رائے پور کی درویشی اختیار کی۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوگئے۔ ہمت اور مستعدی سے سلوک کی منازل طے کرنے لگے۔ حضرت کو بھی آپ پر انتہا درجے شفقت تھی، آپ کو بھائی صاحب کے لفظ سے یاد فرماتے اور سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۹۴۷ء تک آپ کا زیادہ

وقت رائے پور میں گزرا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں آپ حضرت کی اجازت سے اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان تشریف لائے اور سرگودھا شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں آنے والے لوگوں کو شروع میں جن مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان کو وہی لوگ جانتے ہیں جو اس ابتلاء سے گزرے ہیں۔ خاص طور پر زمیندار لوگ زیادہ پریشانیوں کا شکار ہوئے۔ ہندوستان سے کلیموں کا آنا اور یہاں اُن پر جائیداد کا حصول بڑا کٹھن مسئلہ تھا۔ دفاتر اور عدالتوں کی خاک چھاننا پڑتی تھی۔ آپ بھی زمیندار تھے۔ آپ کو بھی ان حوصلہ شکن مراحل سے گزرنا پڑا۔ کنبہ کے اخراجات پورے کرنے کیلئے کچھ عرصہ آپ کو اجناس کا کاروبار بھی کرنا پڑا۔ ان صبر آزما حالات میں بھی آپ کی عبادت اور ذکر و تلاوت وغیرہ معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ نصف شب کے بعد اٹھ کھڑے ہوتے اور صبح تک نوافل اور ذکر و دُعاء میں مشغول رہتے۔ نماز کے بعد اشراق تک مُصلے پر رہتے پھر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر دوکان پر تشریف لے جاتے۔ دفتر یا عدالت کا کام ہوتا تو اس کی ذمہ داری بھی پوری فرماتے۔ ظہر سے عصر تک الگ تھلگ بیٹھ کر تلاوتِ کلام پاک فرماتے۔ مغرب کے بعد بھی زیادہ وقت نوافل میں گزرتا تھا۔ نماز باجماعت کا پورا اہتمام تھا۔ تکبیر اولیٰ میں بھی فرق نہ آتا تھا۔ ہر وقت اللہ سے لو لگائے رکھتے۔ پاکستان آنے کے بعد آپ کے لئے حضرت اقدس وہاں فکرمند رہتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کی رہائش کی مشکلات سن کر پاکستان تشریف لائے تھے اور کئی روز آپ کے ہاں سرگودھا میں قیام فرمایا تھا۔ حضرت کی دُعا اور برکت سے اللہ تعالےٰ نے یہ مشکل دور فرمادی۔ حضرت کا جب بھی پاکستان کا سفر ہوتا آپ کے ہاں کچھ دن ضرور قیام فرماتے تھے۔ آپ بھی پاکستان کے سفر میں حضرت کی خدمت میں زیادہ وقت رہنے کی کوشش فرماتے تھے اور وقتاً فوقتاً رائے پور بھی تشریف لے جاتے تھے۔ رمضان شریف حضرت کی خدمت میں گزارنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ حضرت کو آپ کی علمی و روحانی استعداد پر اعتماد تھا۔ سرگودھا کے قریب کے متوسلین کو آپ کی خدمت میں حاضری کا ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ حضرت کی آپ پر شفقت و عنایت اور غایت درجہ توجہ دیکھ کر بصیرت والے لوگ سمجھ جاتے تھے کہ آپ کو اپنے بزرگوں کی امانت سنبھالنے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ آخر وہ وقت آیا کہ حضرت نے ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء میں آپ کی جانشینی کا فیصلہ فرمادیا۔ اسی سال اگست میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے دنیا سے سفر فرمایا اور آپ جانشین ہوئے۔ اللہ تعالےٰ نے بڑی تاثیر عطا فرمائی تھی۔ بعض خوش نصیبوں نے آپ کے ساتھ چند دن نمازیں پڑھیں اور نمازوں کی حلاوت نصیب ہونے لگی۔ بعض لوگ آپ کی خدمت میں چند منٹ بیٹھے اور ہفتوں تک نمازوں میں استحضار اور لذت محسوس کرتے رہے۔ ایسے بھی لوگ ملیں گے جن کی زندگیاں چند منٹ کی حاضری سے بدل گئیں۔ کتنے لوگ آپ کے فیضانِ صحبت اور تاثیر تربیت سے ملکۂ یادداشت اور باطنی نعمت سے مالا مال ہوئے۔ آپ ہمیشہ دینی کام کرنے والے

مخلصین اور دینی تحریکات کی طرف متوجہ اور دُعاگو رہے۔ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے رائے پور میں مستقل قیام نہ فرما سکے لیکن جب بھی وہاں تشریف لے گئے، خانقاہ کی رونقیں لوٹ آئیں، ذاکرین کا ہجوم ہو گیا اور اللہ کے ذکر سے فضا گونج اٹھی۔ رائے پور کے آخری سفروں میں تو خلقِ خُدا اُمنڈ پڑتی تھی، گرد و نواح اور دور دراز کے لوگ کھنچے آتے تھے۔ روزانہ کئی کئی ہزار لوگ بیعت ہوتے، غیر مسلم بھی بہت زیادہ تعداد میں زیارت کو آتے تھے۔

آپ تین چار سال سے صاحبِ فراش تھے۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ کھانا پینا اور دوسری ضروریات بھی اپنے ہاتھ سے پوری نہ ہوتی تھیں۔ پیشاب کے لئے بھی زیادہ تر نالی لگی رہتی تھی۔ کبھی بیماری کے حملے بالکل لاغر کر دیتے اور خدام مایوس ہونے لگتے، پھر وقت گزرنے کے ساتھ جسم میں قوت آنے لگ جاتی تھی۔ آخری سالوں میں مسلسل یہی کیفیت رہی۔ اتنی شدید تکالیف کا برسوں تک تحمل اور ایسا صبر کہ کبھی بھولے سے بھی زبانِ مبارک سے تکلیف کا اظہار نہ ہو یہ اللہ تعالےٰ کی رضا پر راضی ہونے کا وہ مقام ہے جو اللہ تعالےٰ اپنے خاص مقربین کو عطاء فرمایا کرتے ہیں۔ آپ نے آخری رمضان شریف رائے پور میں گزارا۔ پاکستان سے بھی خدام کی ایک بڑی جماعت ساتھ رہی۔ واپسی کے چند روز بعد طبیعت خراب ہو گئی اور وہ وقتِ موعود آ ہی گیا جس کے تصور سے خدام کے دل دھڑک رہے تھے اور آپ کی روحِ مبارک لقاءِ الٰہی کے لئے اس وقت کی انتظار میں بے تاب تھی۔ ۳ جون کو عشاء کے وقت روحِ مبارک نے قفسِ عنصری سے پرواز کی۔ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی۔

۴ جون کو سرگودھا میں نمازِ جنازہ ہوئی۔ آپ کی عمر بھر کی آرزو کے مطابق آپ کے صاحبزادوں نے رائے پور میں تدفین کا فیصلہ کر لیا۔ جنازہ پڑھتے ہی لاہور کو روانگی ہو گئی۔ قانونی مراحل طے کرنے کے بعد آپ کو رائے پور لے جایا گیا۔ رائے پور میں جب جنازہ ہوا، رات کے ایک ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ عقیدت مندوں نے جنازہ میں شرکت کی اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے پہلو میں آپ کو آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ طریقت میں اب آپ کے مقام کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا آپ کے جانے سے یہ محفل ہی سُونی پڑ گئی ہے اور چاروں طرف اداسی چھائی ہے روحانیت کی ایسی متاع لٹی ہے جس کا بدل ملنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ خانقاہی نظام کی بساط ہی

(بقیہ صـ۵۷ پر)

مولوی محمد سعید مرحوم
ایڈیٹر پاکستان ٹائمز لاہور

ترتیب و تلخیص
محمد عمر فاروق

شاہ جی اور قافلہ احرار

مولوی محمد سعید مرحوم پاکستان کی انگریزی صحافت کے معمار بزرگوں میں سے تھے۔ ڈان، پاکستان ٹائمز، ٹائمز آف کراچی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ میں کام کیا۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ مرحوم اردو کے صاحبِ اسلوب نثر نگار تھے۔ ۱۹۹۱ میں بعمر اسی سال وفات پائی زیر نظر مضمون ان کی ذاتی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "آہنگ بازگشت" سے لیا گیا ہے

انگریز جب آزادئ مذہب کی آڑ میں ـــ ـــ ـ ـ ـــ ـ ـــ ـــ

غیر جانبدار ہو گیا تو گھٹیا قسم کے چند ہندو مصنفوں اور ریفارمروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نجاست اُچھالنے کو پیشہ بنا لیا۔ بہرکیف دلی میں عبدالرشید کے ہاتھوں شردھانند کیفرِ کردار کو پہنچا۔ لاہور میں علم الدین کے ہاتھوں راجپال اور کراچی میں عبدالقیوم کے ہاتھوں شاتمانِ رسولؐ کے اس انجام نے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

مسلمان قوم نے اپنے غیظ و غضب کے اظہار میں کسی مداہنت کو روا نہیں رکھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک جلسہ میں برملا کہہ دیا: "اللہ سے گستاخی کرنے والوں سے تو وہ خود نپٹ لے گا۔ لیکن رسولؐ کی طرف اُٹھنے والی اُنگلی کو ہی نہیں، شانے سے بازو تک کو کاٹ دیا جائیگا۔"

یہ محض حادثہ نہیں تھا کہ خلافت ایجی ٹیشن کا اتحاد و اتفاق ہندو مسلم فسادات کے خونیں سلسلے کی نذر ہو گیا۔ اور آزادی کی قرارداد پاس ہوتے ہی شاتمانِ رسولؐ کی ایک کھیپ پیدا ہو گئی۔ صاف عیاں ہو چکا تھا کہ یا آزادی کا خواب پریشان کیا جا رہا ہے یا آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دکھائی جا رہی ہے۔

بہرکیف کچھ عوامل ضرور ایسے کارفرما تھے، خواہ وہ نفسیاتی ہوں یا سیاسی، جو دو قوموں کے اتحاد کے درمیان متواتر حائل ہو رہے تھے۔

ہندو ڈوگروں کے غرور کی انتہا بالآخر قرآنِ پاک کی توہین کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ کشمیری کہ جنہوں نے بے چارگی میں برسوں اپنے بچوں کے گلگوں چہروں پر طمانچے پڑتے دیکھے تھے۔ اس سانحہ پر اُن کے ہاتھ سے بھی دامنِ صبر چھوٹ گیا۔ وُہ اُٹھے اور ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے روز اپنے جابر حکمران کے ساتھ ٹکرا گئے۔ یہ تاریخی تصادم امیرا کدل پر ہُوا۔ حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ کشمیریوں نے ڈوگرے سپاہیوں سے بندوقیں چھین چھین کر دریا میں پھینک دیں۔ پشاور کے بعد سری نگر شمالی ہندوستان کا دُوسرا شہر تھا جو اُن دِنوں مُسلمانوں کے خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

وادیٔ کشمیر میں جو جنگ ڈوگروں کے خلاف جاری ہو چکی تھی۔ اُس کی بازگشت پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہُوئے پنجاب کے ہر قریہ اور ہر شہر میں ہوئی۔ احرار کے ابتدائی ایام تھے۔ احرار کی بے پناہ خطابت کے لیئے اس سے بڑھ کر اور کوئی موضُوع مناسب نہ تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے پنجاب کے طول و عرض میں اپنی شعلہ بیانی سے آگ لگا دی۔ سُرخپوش ابھی تک قصہ خوانی کے معرکہ خونین سے پُوری طرح نہ اُبھر سکے تھے۔ خاکسار تحریک کے خطوط ابھی تک غیر مرئی تھے۔ لیگ اپنی مجبوریوں اور کانگرس اپنی مصلحتوں کی بناء پر اس تحریک میں اُلجھنا نہیں چاہتی تھی۔ کشمیر کمیٹی مشن کی قیادت چنانچہ احرار کے ہاتھ میں آگئی۔ اور وُہ اُس کے لئے موزوں تھے۔ مسئلہ مُسلمانوں کی آزادی اور اُن کے مذہبی تحفظ کا تھا۔ انھیں دو اجزاء سے احرار کی حکمتِ عملی نے ترکیب پائی تھی۔ قید و بند سے وُہ خائف نہیں تھے۔ اُنکی قیادت نے اگست ۱۹۳۱ء میں تیس ہزار آدمیوں کو ڈوگروں کی جیلوں اور کیمپوں میں بھیج دیا۔ سیالکوٹ شہر کا کوئی جوان ایسا نہ ہوگا جس نے سچیت گڑھ کے کیمپ کے خاردار تاروں کے پیچھے چند دِن نہ گزارے ہوں۔ قافلے جب ظفر علی خان کا نغمہ "کشمیر چلو۔ کشمیر چلو" گاتے ہُوئے نکلتے تو منظر دیدنی ہوتا۔ بیویاں خاوندوں کو اور مائیں بچوں کو بڑی دعاؤں اور ولولوں کے ساتھ رُخصت کرتیں۔

پنجاب کے ہندو پریس نے حسبِ معمول اس مسئلے کو اُسی نگاہ سے دیکھا جس سے وہ ہر مسئلے کو دیکھنے کا عادی تھا۔ اُنھوں نے یہ نہ دیکھا کہ ایک خطّے کے لوگ وہاں کے جابر حکمرانوں کے پنجۂ استبداد کی گرفت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے مہاراجے کے نام کی رعائیت سے اسے بھی ہندو مُسلم مسئلہ بنا دیا۔ چنانچہ آریہ سماجی پرچارک جگہ جگہ پھیل گئے۔ مسلمان والیانِ ریاست کے ظلم و جور

کے ایسے ایسے افسانے گھڑے گئے کہ تاریخ انگشت بدنداں رہ گئی۔

ان دنوں احرار کا ستارہ بڑے عروج پر تھا۔ پُورا پنجاب اُن کی مٹھی میں تھا۔ عوام سے اُستوار رابطہ یونینسٹ پارٹی اور اُس کے ارباب بندوبست کے لئے سوہانِ رُوح ثابت ہو رہا تھا۔ اِس لئے کہ اگلے چند برسوں میں یونینسٹ پنجاب کی سرزمین پر سر فضل حسین کی قیادت میں بلا شرکت غیرے اپنا پھریرا لہرانا چاہتے تھے۔ احرار تو ان کے نزدیک خیر کسی شمار قطار میں نہیں تھے۔ وُہ لیگ تک کو اپنی قلمرو میں نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ مجلسِ احرار وہ پہلی جماعت تھی جو پنجاب کے جاگیرداروں اور سرکار پرستوں کے لئے بے اطمینانی کا باعث تھی اور جس کا رابطہ براہِ راست عامۃ الناس سے تھا۔ بہرکیف دونوں اُبھرتی ہُوئی قوتوں میں ٹھن گئی۔ احرار کہ ہو متمرد راجواڑے کو سرنگوں کر چکے تھے اور یونینسٹ کہ جن کی پشت پر انگریز کا دبدبہ اور سر فضل حسین کی زیرکی تھی تحریک کشمیر کے دوران ہی اِس تناؤ کے آثار ہویدا ہو چکے تھے۔ ہری سنگھ ڈوگرے کی تذلیل کے بعد اُنھوں نے اپنا رُخ سر فضل حسین کی جانب کر لیا۔

لائلپور کے دھوبی گھاٹ میں ان کا اجتماع ایسا فقید المثال تھا کہ چاروں طرف احرار کی قوت کی دھوم مچ گئی۔ احرار نے لائلپور سے فارغ ہو کر پسرور میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب اینٹوں کے ایک ویران بھٹے کے پاس کھلے میدان میں اُن کا پنڈال نصب ہُوا۔ آبادی کے لحاظ سے پسرور کا جلسہ بھی کچھ کم کامیاب نہیں تھا۔ جلسے کے دوران مجھے ایک دوست چودہری علی محمد باجوہ نے جو لاہور سے آئے تھے بتایا کہ مسجد شہید گنج کا تنازعہ بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اور لاہوری مسلمانوں کی یورش محلہ دارا شکوہ پر برابر ہو رہی ہے۔

۹ر جولائی ۱۹۳۵ء کا دن شہید گنج کے پرستاروں کے لیئے قیامت کا دن تھا۔ لاہور کے دلی دروازہ کے باہر محلہ دارا شکوہ پر مسلمانوں کی یورش ہو رہی تھی۔ ناکہ خاردار تاروں سے بند تھا۔ کوتوالی کی برجیوں پر گورا فوج ہتھیار نصب کئے بیٹھی تھی۔ جوانانِ لاہور چھاتیاں کھولے موجوں کی صورت میں آگے بڑھتے جاتے اور موت کے گھاٹ اُترتے جاتے۔ یہ خبر مجھے احرار کے جلسہ میں ملی۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے وقت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن

لدھیانوی کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ لیسنر کی سرکلر روڈ پر کاشانہ میں اُن کا قیام تھا۔ کھانے سے فارغ ہُوئے ہی تھے کہ میں نے سلام عرض کیا۔ میں نے جاتے ہی پُوچھا کہ

"لاہور میں جو گولی چل رہی ہے اُس کی ذمہ داری کس پر ہے؟" سید صاحب کچھ کہہ نہیں پائے تھے کہ مولانا لدھیانوی نے گرج کے کہا: "جاؤ۔ کرم آباد، ظفر علی خان سے پُوچھو۔" پیشتر اس سے کہ میں کچھ اور عرض کرنے کی جسارت کرتا۔ شاہ صاحب نے مجھے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا۔ بڑی شفقت سے خیر و عافیت پُوچھی۔ میرے جذبے کو سراہا۔ اور پھر کسی قدر جوش میں آکے پُوچھا:

"اگر پنجاب میں خانہ جنگی چھڑ گئی تو تیار ہو؟"

میں خاموش رہا۔ پھر خود ہی کہنے لگے: "آج ہی لاہور تجا کے عورتوں کے بُرقعے اُتروا سکتا ہُوں لیکن اگر پنجاب میں خُون کی ندیاں بہہ نکلیں تو کون ذمہ دار ہو گا؟"

پچھلے پہر مولانا حبیب الرحمٰن کو جلسہ میں تقریر کرنا تھی۔ تقریر کے دوران اُنھوں نے احرار کو اُلجھانے کے جو منصوبے بن رہے تھے اُن کا ذکر کیا اور کہا کہ

"میں ایسا نااہل جرنیل نہیں ہُوں کہ جو فوج کو دو نحاذوں پر لڑا کے فنا کر دے۔"

شہید گنج کا قضیہ طُول کھینچ گیا اور مسجد تھوڑے سے رد و بدل کے بعد گوردوارے میں بدل دی گئی۔ واقعات کی رو میں نہ صرف احرار ہی کچلے گئے بلکہ مولانا ظفر علی خان بھی نہ اُبھر سکے۔

ظفر علی خان اور احرار کے درمیان بڑے بڑے قلمی اور زبانی مجادلے ہُوئے اسی زمانے میں ایک دُوسرے کے مجمعوں کو منتشر کرنے کی ایسی ترکیبیں سوچی جاتیں کہ لوگ عش عش کر اُٹھتے۔ سیالکوٹ میں مولا بخش کے تالاب کو خشک کر کے وہاں احرار نے اپنا کنونشن جمایا۔ سیالکوٹ احرار کا ناقابلِ تسخیر حصار سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے یہ کنونشن اپنے رکھ رکھاؤ اور تزک و احتشام کے اعتبار سے بڑے برتن کی بڑی کھرچن ثابت ہُوا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تقریر کر رہے تھے کہ جلسہ گاہ کے ایک کونے سے ظفر علی خان زندہ باد کا نعرہ بلند ہُوا۔ دو چار آوازیں اور شامل ہو گئیں، مولانا جلال میں آگئے اور پکارے: "والنٹیرز

نکال دو ان مرزائیوں کو۔ ظفر علی خان بہادر رہے ہم اُس کے وارث ہیں ہم بہادر ہیں' ظفر علی خان ہمارا وارث ہے۔ بہادروں کی محفل میں ان بزدلوں کا کیا کام؟" نعرہ باز ہاتھوں ہاتھ دروازے تک اور پھر سڑک تک پہنچا دیئے گئے۔ اور جلسہ جاری رہا۔

جلسے کے ایک اجتماع کی صدارت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کی۔ تلاوتِ قرآن پاک ہو۔ رہی تھی کہ مولانا حبیب الرحمن اپنے خیمے سے برآمد ہو کر جلسہ گاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اُن کے آگے آگے بینڈ مارچنگ کی دُھن بجا رہے تھے۔ اور نعرے لگ رہے تھے۔ آوازیں ہمیں جلسہ گاہ میں برابر آ رہی تھیں۔

مولانا مظہر علی اظہر کی تقریر بڑی معرکہ آرا تھی۔ ایک مقام پر انھوں نے انگریز حکمرانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا: "مسلمانوں کے جذبات سے مزید کھیلنا بغاوت کو دعوت دینا ہے"۔ اس جملے پر شاہ صاحب کرسیٔ صدارت سے اُٹھ کر فرطِ جوش سے اسٹیج پر ٹہلنے لگے۔

مولا بخش کے تالاب کا جلسہ احرار کا دمِ واپسیں تھا۔

جس شخص کو لاہور کا وُہ دَور دیکھنا نصیب ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ جو قوم دولتوں سے عافیت کوش اور مصلحت اندیش ہو چکی تھی۔ اس کی اگلی نسل کی تربیت کہاں ہو رہی تھی۔ ان شکستہ دیواروں سے عطاء اللہ شاہ بخاری کی للکاریں ٹکرا چکی ہیں۔ موچی دروازے نے اقبال کا جوابِ شکوہ سُنا۔ دلی دروازے نے ظفر علی خان کے نغمے اور نعتیں سُنی ہیں۔

جلسے جس اہتمام سے جمائے جاتے اُسی اہتمام سے برہم بھی کئے جاتے۔ اِس دَور میں تو گولی اور بم نے جلسوں کے اُجڑنے کا سارا لُطف غارت کر دیا ہے۔ اُن دنوں جیسے جمائے جلسے محض پھپھڑوں کے زور سے ہوا میں اُڑا دیئے جاتے۔ شروع شروع میں تو جلسہ گاہ کے گوشوں پر بُرے بیچے سُروں میں پھبتیوں۔ ضلع جگتوں۔ طعنوں اور نعروں کی گونج سُنائی دیتی۔ کچھ دیر تک تو زمرمور کی تیز دستی اُنھیں دبائے رکھتی۔ پھر آواز اسٹیج کی جانب قدم بہ قدم بڑھتی سُنائی دیتی تاآنکہ والنٹیر کُود جاتے اور پھر یک لخت دست بدستے دگرے کا سماں پیدا ہو جاتا۔ گھڑی دو گھڑی بعد کوئی ٹوٹی ہوئی طناب یا کسی نقش پا کی شوخی کہہ دیتی کہ ابھی کوئی اِس راہ سے گزرا ہے۔

لاہوریوں کو ایک مرتبہ ایسے ہی موڈ میں پا کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے للکار کے کہا: "دُہی دتی

دروازہ ہے۔ وُہی پیپل کا پیڑ۔ برس دِن کے بعد لَوٹ کے آیا ہوں۔ پھر برسا لو پتھر۔ خُدا کی قسم تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ عبداللہ کے یتیم بیٹےؐ نے مجھے یہی سکھایا ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ آخری جُملے نے پُوری محفل کو بیخود کر دیا تھا۔ میرے قریب گھاس پر ہی لاہوری جماعت کے مولوی صدرالدین بیٹھے تھے وُہ ہڑبڑا کے پاؤں کے بل بیٹھ گئے اور اُنکے مُنہ سے اللہ اللہ اس طرح بے ساختہ نکلا کہ جیسے بجلی کی کڑک نے اُنھیں نیند سے بیدار کر دیا ہو۔

آج جب کبھی دلّی دروازے سے گزرتا ہُوں اور اُس اُداس اور کہنہ سال پیپل کو دیکھتا ہُوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہہ رہا ہو :

سنگ در دیوارہا از شوخیِ طفلاں نماند
شہر گر ویراں شود، خود را بصحرا میکشم

(بچوں کی شوخیوں نے کوئی پتھر دیواروں میں نہیں چھوڑا اور اگر شہر یوں ویران ہو گیا تو میں صحرا کو چل دوں گا)

علیگڑھ کی مرکزی حیثیت کا اندازہ اُس ایک جُملے سے ہوتا ہے جو سیّد عطاء اللہ شاہ بُخاری نے ایک مرتبہ یونین ہال میں تقریر شروع کرنے سے قبل کہا۔ کہ جب لاہور سے چلا تو احباب نے کہا کہ اگر علیگڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اگر پُورے ہندوستان کے مُسلمانوں سے کچھ کہنا ہے تو یونیورسٹی میں تقریر کرنا۔

علیگڑھ لفظوں کے اندر تغیر لانے کا اہتمام تھا۔ علیگڑھ نے اگرچہ ابتدا ہی سے بڑے سیاسی معرکے دیکھے تھے اور خود اس کا اپنا وجُود ایک سیاسی اقدام تھا لیکن جس دَور میں سے یہ اس صدی کے چوتھے عشرے میں گزر رہا تھا وُہ بڑا فیصلہ کُن تھا۔

اس عرصے میں علیگڑھ میں چار عظیم ہستیاں آئیں۔ حکمرانوں کے جذبات کے ترجمان لارڈ لوتھین کہ جن کے بارے میں عام تأثر تھا کہ وُہ وائسرائے بن کر آ رہے ہیں۔ کانگرس کے ذہن کی ترجمان مسز سروجنی نائیڈو، مسلمان وطن پرستوں کے نمائندہ سیّد عطاء اللہ شاہ بُخاری۔ اور مُسلمانوں کے اُبھرتے ہُوئے سوادِ اعظم کے نمائندہ قائدِ اعظم محمد علی جناح۔ یہ مشاہیر اپنے اپنے رنگ میں فقید المثال تھے۔

سروجنی نائیڈو شاعرہ تھیں۔ اپنے ہمعصر لوگوں میں وُہ قائد کی بے حد مداح تھیں ثقافت اُنھیں مسلمانوں کی مرغوب تھی اور سیاست گاندھی جی کی۔ بہادر یار جنگ کی خطابت کی دلدادہ تھیں۔ اور خُود بھی سحر بیان مقررہ تھیں۔

قائدِ اعظم مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سمبل بن کے اُبھرے۔ منطق اُن کی تیغ بستہ ہوتی اور خطابت شُعلہ فشاں، دلائل پر جائیے تو مفر نہیں تھا۔ خطابت پر جائیے توڑ کنا محال ہوتا۔

عطاءُ اللہ شاہ بُخاری، خُوبرو۔ خوش گلو۔ خطابت کی ہر رمز کے شناسا۔ اسٹیج پہ آتے تو آنکھوں کو بھلے لگتے۔ بولتے تو فردوسِ گوش اور تقریر جیسے جیسے بڑھتی دماغ دل کے حق میں دستبردار ہو جاتا اور دل شاہ صاحب کی اُنگلیوں میں ہوتا۔ شاہ صاحب نے یونین ہال میں ایک معرکہ آرا تقریر میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی تفسیر بیان کی۔ یُونین کے صدر کو گمان گزرا کہ تقریر شائد فرقہ وارانہ ہو جائے گی۔ چنانچہ اُنھوں نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ فرقہ وارانہ تقریر یونین کے قواعد کی رُو سے ممنُوع ہیں شاہ صاحب نے اطمینان دلایا کہ یُونین کی ہر روایت کی پاسداری کی جائے گی۔

تقریر شروع ہُوئی اِس حال میں کہ اسٹیج پہ دیگر حضرات کے عِلاوہ رشید احمد صدیقی جیسے بذلہ سنج اور شُستہ مذاق اور ہادی حسن جیسے سحر بیان بیٹھے ہُوئے تھے۔ شاہ صاحب جب ظرافت پر آتے تو رشید احمد ہنسی ضبط نہ کر سکتے اور جب خطابت کی بلندیوں کو چھُوتے تو ہادی حسن جُھوم جُھوم جاتے۔ اُن کی تقریر کا نقطۂ عرُوج وہ سین تھا جب اُنھوں نے اپنے رُومال کی جھولی بنا کے آگے بیٹھے ہُوئے بچّوں سے کہا کہ آؤ بچو مٹھائی لیتے جاؤ۔ ایک ایک بچہ آگے بڑھتا، شاہ صاحب اُسکی جھولی میں کُچھ نہ کُچھ ڈال دیتے۔ جب آخری بچہ آیا تو اُس کی جھولی میں سب کچھ اُلٹ دیا اور جب اس کے بعد بھی ایک بچہ اچانک اُٹھ بیٹھا تو شاہ صاحب نے اپنا خالی رُومال ہوا میں لہرا کے وجد آفریں قرأت میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا اعلان کر دیا۔ یہ آیت اس سوز اور حمیت سے پڑھی کہ پُورا ہال تحسین کے نعرُوں سے گُونج اُٹھا۔ اقبال کے مصرعہ" داد مارا آخریں جامے کہ داشت " کو یُوں حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے ہُوئے آنکھوں نے اُس روز دیکھا۔ شاہ صاحب کو زبان پر جو عبُور

حاصل تھا اس پر انھوں نے اپنے فخر کا دلی اور لکھنؤ والوں کو خطاب کر کے اظہار یہ کہہ کر کہ "برس دن کے بعد اردو میں تقریر کر رہا ہوں۔ کہیں زبان کی غلطی کر جاؤں تو ٹوک دینا۔"

میں تقریر سن رہا تھا اور میرے ذہن میں شاہ صاحب کی ایک اور ہی تصویر ابھر رہی تھی۔ چونڈے کا دیہاتی اسٹیج ہے، ان پڑھ لوگوں کا ہجوم ہے۔ شاہ صاحب پنجابی میں تقریر کر رہے ہیں اور ان سادہ ورق لوگوں کے دلوں کو گرماتے جا رہے ہیں۔ یا پھر گلو شاہ کے میلے میں منبر بچھا ہوا ہے اور وہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں اور لوگ سر دھن رہے ہیں۔ اسٹیج علیگڈھ کا ہو یا موچی دروازے کا منبر جامع مسجد دہلی کا ہو یا گلو شاہ کا۔ شاہ صاحب کا جادو یکساں ایمان افروز ہوتا۔

قافلۂ احرار کہ جو گزشتہ پندرہ برسوں میں بڑے جانگداز نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ اب اس مقام پر پہنچ گیا کہ کانگریس اُن کے اپنے نزدیک اب ایک فاشسٹ جماعت ہو چکی تھی۔ چنانچہ نبیرزادہ نصراللہ خان نے کہ جو ان دنوں احرار کے قافلہ سالار تھے۔ ایک بیان جاری کیا کہ چونکہ کانگرس کے ہاتھوں ملک کا امن تباہ و برباد ہو گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اپنی سیاسی سمت پر نگاہ ثانی کی جائے۔ اور اب وہ پالیسی اختیار کی جائے جو مسلمانوں کی امنگوں کی ترجمان ہو۔" احرار نے بہار اور نواکھلی کے فسادات کی مذمت کی اور اپنی سعی کو کاملاً "ہندی مسلمانوں کی رستگاری" کے لئے وقف کر دیا۔

احرار کی سیاست اگرچہ بڑے نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ تاہم وہ ایک بات میں بڑے ثابت قدم رہے اور وہ انکی قادیان دشمنی تھی۔ انھیں جس شہر اور جس اسٹیج سے موقعہ ملا انھوں نے اس دشمنی کا اظہار بھرپور انداز میں کیا۔ پاکستان بننے کے بعد ایسا دکھائی دیا کہ سیاسی اسٹیج پر سے ہمیشہ کے لئے اتر گئے ہیں۔

ایک رات[1] دفتر میں آ کے بیٹھا ہی تھا کہ معلوم ہوا سید عطاء اللہ شاہ بخاری آرام باغ میں تقریر کرنے والے ہیں۔ اخبار کو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے دوسروں کے سپرد کر کے آرام باغ چلا گیا۔ شاہ صاحب کو سنے ہوئے مدت ہوئی تھی اور پاکستان بننے کے بعد سے انھیں دیکھا بھی نہیں تھا۔

---

[1] دفتر روزنامہ "ڈان" کراچی

تقریر شروع ہوئی تو وہی اعتماد، وہی خوش الحانی اور خوش گفتاری۔ میں سمجھا کہ شاید احرار کی نشاۃ ثانیہ کا اعلان ہوگا۔ اسکی بجائے شاہ صاحب نے اپنے معترضین کو یہ اعلان کر کے دم بخود کر دیا کہ جس سرکار کے تم گُن گاتے ہو وہاں تک اوروں کی بھی پہنچ ہے اور یہی نہیں بلکہ ان کے گوش گزار کر دیا گیا ہے کہ اگر تم غافل رہے تو تمہارا حشر حسنی زعیم کا سا ہوگا۔

تقریر اس خوبی سے مزین تھی جو کسی بڑے خطاب کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ شاہ صاحب حکمرانوں کے نزدیک نہ صرف یہ کہ معتوب نہیں رہے تھے بلکہ انکی عدیم المثال خطابت سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی جائے گی۔ تقریر کا مقصد بہ حصہ مرزائیت کے خلاف تھا۔

میں تقریر کے دوران ہی دفتر چلا آیا اور اس کے ساتھ ہی وہ ربع صدی اختتام کو پہنچی جس میں نُطق کی سحرکاری کو ہزار جلووں میں دیکھا۔

کچھ امیر شریعت نمبر کے بارے میں

گذشتہ شمارے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اگست کا شمارہ "امیر شریعت نمبر" ہوگا۔ اس پر بعض مخلص دوستوں اور اراکینِ ادارہ نے مشورہ دیا کہ ستمبر ۱۹۹۲ء میں حضرت امیرِ شریعتؒ کا صد سالہ یومِ ولادت ہے۔ کیوں نہ اس موقع پر نقیبِ ختمِ نبوت کا ایک ضخیم نمبر شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسی حوالہ سے اکتوبر کا شمارہ حضرت امیرِ شریعتؒ کے نامِ نامی سے منسوب کیا جا رہا ہے جو تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا۔

یہ یادگار نمبر ـــــ مستقل خریداروں کو -/۵۰ روپے میں پیش کیا جائے گا اور عام قارئین کو -/۱۰۰ روپے میں۔ جب کہ پیشگی رقم ارسال کرنے والے عام قارئین -/۸۰ روپے میں حاصل کر سکیں گے۔

یاد رہے کہ صد سالہ یومِ ولادت کے حوالہ سے یہ نمبر جلد اوّل ہوگا۔ جب کہ حضرت شاہ جی کے سیرت و سوانح پر مشتمل مختلف پمفلٹ اس کے علاوہ شائع کئے جائیں گے۔

بہت سے قارئین نے امیرِ شریعت نمبر کے لئے مضامین ارسال فرمائے ہیں۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے وہ سب ایک ساتھ شائع نہ ہوسکیں گے۔ البتہ نقیب کی مختلف اشاعتوں میں انہیں ضرور شامل کر لیا جائے گا ـــــ (ادارہ)

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

معجز بیان، سحر اللسان

ابھی مولوی عبدالحق کو دنیا سے سدھارے پورا ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ملتان میں وفات پاجانے کی خبر ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

شاہ جی کی ابتدائی تعلیم و تربیت پٹنہ میں ہوئی جو دلی اور لکھنو کے بعد اردو زبان اور شعر و شاعری کا تیسرا مرکز تھا اور اسی کا اثر تھا کہ شاہ جی نسلاً پنجابی ہونے کے باوجود اردو زبان ٹکسالی بولتے اور اس کے محاورات و ضرب الامثال پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔

۔ نانی سے اردو بول چال کی زبان سیکھی۔ شاد عظیم آبادی کے اس خاندان سے ذاتی مراسم تھے۔ اس تقریب سے شاہ جی کو بھی شاد عظیم آبادی کی صحبتوں میں بیٹھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ذہانت و فطانت خداداد تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کم عمری میں ہی پختہ ہو گئے، دماغ چمک اٹھا اور زبان منجھ گئی، پھر پٹنہ سے نکل کر مختلف علماء سے وقتاً فوقتاً تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس لیتے رہے۔ لیکن وہ بھی بے ضابطہ اور بے قاعدہ[۱]

شاہ جی یوں تو علم و فضل اور سیرت و اخلاص کی بہت سی خوبیوں اور کمالات کے جامع تھے جن کی وجہ سے لوگ ان کی دل سے قدر اور عزت کرتے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا کمال جس میں کوئی ان کا ہم عصر ان کا شریک نہیں ہوسکتا تھا وہ ان کا کمال خطابت و تقریر تھا۔ گھنٹوں یکساں روانی جوش اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بولتے تھے اور کیا مجال کہ ایک شخص بھی اکتا کر مجلس سے اٹھ جائے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تقریر نہیں کر رہے ہیں نشہ پلا رہے ہیں۔ سامعین تو سامعین فضا تک پر معلوم ہوتا ہے سکر کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی تقریر سنتا تھا اور جھومتا تھا۔ ان کے پاس اعجاز بیان اور سحر خطابت کا ایسا کارگر حربہ تھا کہ اگر وہ چاہتے تو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لئے اس سے زیادہ کام لے سکتے تھے لیکن ان کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ تحریک خلافت، مجلسِ احرار اسلام اور ہر میدان میں صرف ایک سپاہی بنے رہے۔ دوسروں کے تابع رہ کر کام کیا لیکن کبھی خود قائد نہیں بنے۔ ہمارے نزدیک دینی اعتبار سے شاہ جی کے لئے اس سے بڑا کوئی دوسرا شرف اور مقام نہیں ہوسکتا تھا کہ جب انہیں امیر شریعت منتخب کیا گیا تو سب سے پہلے حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے جو اس زمانہ میں علم و فضل میں اللہ کے حجت تھے۔ شاہ جی کے ہاتھ پر بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ بیعت کی۔ یہ صرف دنیا کا ہی سب سے بڑا اعزاز نہ تھا بلکہ یہ بیعتِ انوری اس کی بھی ضمانت تھی کہ اللہ کے یہاں اس کا حسن عمل اور دینی ولولہ و جوش مقبول ہو چکا۔ اور آج وہ دنیا میں نہیں ہیں تو امید قوی ہے۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کی دعوت قدس کے خلعت فاخرہ سے سرفراز و شادکام ہو رہے ہوں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ

(ماخوذ، نظرات: "برہان" دہلی ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۳۱، ۱۳۲)

۱۔ شاہ جی دورانِ تعلیم ہی قید و بند کی صعوبتوں سے آشنا ہو گئے اس لئے سلسلہ تعلیم میں تسلسل قائم نہ رہ سکا، مگر اس کے باوجود آپ نے دورۂ حدیث تک تعلیم مکمل کرلی۔ (ادارہ)

پروفیسر تاثیر وجدان

امیرِ شریعتؒ

زندگی کی ایک موجِ تند جولاں

زیرِ نظر مقالہ محترم پروفیسر تاثیر وجدان صاحب نے ۲ستمبر ۱۹۹۱ میں حضرت امیر شریعتؒ کی یاد میں دارِ بنی ہاشم ملتان میں منعقدہ تقریب میں پڑھ کر سنایا۔ (ادارہ)

اہلِ خیر کی اس مجلسِ ذکر و فکر میں میری شرکت تو صرف حصولِ اجر و ثواب کی نیت سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے انسان کی عظمت کے اعتراف کے لئے خود معترف میں کسی نہ کسی درجے کی عظمت کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو مجھ میں نہیں۔ مجھ ناچیز کا مقصد و مدعا شاہ جی مرحوم کی زندگی کے سوانح کی گہری تحقیق نہیں، نہ ہی ان کے شخصی اور نجی حالات و واقعات کی پوری پوری تدوین میرا مقصود ہے اور نہ ہی ان کے مجاہدانہ، خطیبانہ اور مصلحانہ اور عارفانہ مقام و مرتبہ کے بارے میں کوئی باقاعدہ اور جامع مقالہ پیش کرنا میرا ہدف کہ مجھ میں اس کی اہلیت ہی نہیں۔ ان چند سطور کا منشا تو صرف ۱۸۹۱ء اور ۱۹۶۱ کے درمیان کی عظیم ۷۲ سالہ زندگی کے سامنے جو پٹنہ سے چلی اور خاکِ ملتان میں ہمیشہ کے لیئے روپوش ہوگئی سر جھکا کر صرف اظہارِ عقیدت کرنا ہے۔

عقیدتوں کی زبان جذباتی اور تاثراتی ہوجایا کرتی ہے۔ اس لئے میں معذرت خواہ ہوں کہ میری اس جذباتی ژولیدہ بیانی کا خطاب بھی آپ کی تجزیاتی اور استدلالی عقل سے نہیں بلکہ براہِ راست آپ کے دل سے ہے۔ کیونکہ یہ طے ہے کہ جس محفل سے میں مخاطب ہوں وہ بنیادی طور پر اہل دل ہی کی محفل ہے

خدائے بزرگ و برتر کے جوشِ رحمت نے اس بسیط و بیکراں کائنات کو پیدا کیا، اور اس کے استمرارِ رحمت نے اس ارضی کائنات میں اولادِ آدم کی دائمی و روحانی کفالت اور خبرگیری کے لئے مسلسل انبیائے کرام بھیجے۔ پہلی بات کو قرآن نے رحمانیت کہا اور دوسری کو رحیمیت۔ نبوت مرحلہ در مرحلہ اپنے ارتقاء کے فطری مقسوم کو پورا کرتی ہوئی جب اپنے آخری نقطۂ کمال کو پہنچی تو وہ نبوت آخرالزّمان کے نام سے موسوم ہو کر حیات و کائنات کے دائرے میں آخری اور اپنی رحمتوں کے گراں قدر آبِ حیات سے تمام معلوم اور نامعلوم دنیاؤں کو ان کی آخری سرحدوں تک سیراب کر گئی۔

اے ترا قدسی ظہور انعامِ ربِّ کائنات!
کون جانے تیری رحمت کی پناہ گاہی کی حد
تیری رحمت کی ہمہ گیری کا سچا سائباں
دکھ سے پتھرائے ہوئے چہروں کا دمساز و انیس

اے پیمبرِ خلد کا ابرِ کرم تیرا وجود۔
کیا خبر کن کن جہانوں پر ہے کب سے سایہ گستر
دھوپ میں جلتے سروں کا آخری ملجا و ماویٰ
غم شناس و مہرباں آغوشِ مادر کی طرح

اس انتہائی برتر اور انتہائی برگزیدہ نبوّۃ نے ساری مخلوق میں نوعِ انسانی کی عزت بڑھا دی۔ اب ربِّ کریم نے ہمیں پھر اپنے کرم سے نوازا، اور نبوّت آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوڑے ہوئے گراں قدر روحانی ورثے کے محافظ اور اس کے اسوۂ حسنہ کی عظیم روایات کے وارث اور امین بھی پیدا کر دیئے۔ جنہوں نے انسانی روح کے لہلہاتے چمن زاروں کو تندئی بادِ صرصر سے بچایا۔ ان وارثانِ نبوت میں مفسرین، محدثین، مجتہدین مجاہدین، علماء، فقہاء، صلحاء، اتقیاء، اولیاء، حفاظ قرآن اور قاریانِ کرام وغیرہم شامل رہے۔ غرضیکہ عظیم، مقدس اور نہایت ہی قیمتی ہستیوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا، جو اسلامی تاریخ کا ایک بھرپور اور جیتا جاگتا تسلسل بن کر کرۂ ارض کی زندگی کو اپنے فیض سے سیراب کرتا رہا۔ انسانی روحوں کی آبیاری کرنے والے اسی دجلۂ خیر و برکت کی ایک موجِ تند جولاں کا نام تاریخ نے عطاء اللہ شاہ بخاری رکھا، جس نے بڑے بڑے نہنگوں کے نشیمنوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

یہ کیسی زندگی تھی جو واقعۃً سرزمینِ ہند پر ایک موجِ تند جولاں بن کر ابھری اور پھر اپنے ساتھ متوازی چلنے والے پورے سیاسی، سماجی اور مذہبی عہد کو ایک نہایت فعّال عنصر بن کر دور دور تک متأثر کر گئی۔

اس کی باغیانہ غیرت، اس کی سرفروشانہ جرأت، اس کی قلندرانہ ادا اور اس کے سکندرانہ جلال نے اپنے دور کے مستبد اور ظالم یورپی حکمرانوں اور ان کی کاسہ لیس نوکر شاہی کی راتوں کی نیند حرام کر دی، اس نے ناموسِ رسالت کے ڈاکوؤں کا عمر بھر پیچھا کیا، یہ کیسی زندگی تھی جو ٹوٹ جانا اور بکھر جانا جانتی ہی نہ تھی، وہ نہ نکبت و ہزیمت سے واقف تھی اور نہ ہی دشمن کے ساتھ کسی مفاہمت یا سمجھوتے کا اس کے ہاں کوئی تصور تھا۔ یہ کیسی زندگی تھی جس نے حق کی نمائندہ بن کر باطل کے ساتھ دائمی ٹکراؤ اور ایک ابدی کشمکش کو اپنا مقدر بنا لیا تھا، شب و روز مزاحمت اور شب و روز پیش قدمی، شر کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ تصادم اور ہر بار چوٹ کھا

کر زندہ تر ہو جانے کی ادا اور دشمن سے نپٹنے کی تازہ تر آرزو اور امنگ ؎

آتشِ زندہ میں ہو جاتے ہیں بجھ کر زندہ تر　　　　مر کے بھی اُٹھنے کا سرِّ ارتقاء رکھتے ہیں ہم

حضورؐ کے منہ مانگے گرامی قدر اور گراں قدر رفیق حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے استقامت کی وضاحت یہ فرمائی تھی کہ آدمی شیر کی طرح جم کر سیدھا چلے، لومڑی کی طرح دائیں بائیں نکلنے کے راستے نہ ڈھونڈے۔ اسی انداز کی بے خوف استقامت اور اسی طرح عمر بھر کے لئے جادۂ حق پر مضبوط اور اٹل گام زنی اور پیش قدمی امیرِ شریعتؒ کا وہ پرکشش بے باکانہ کردار ہے جسے بے ساختہ گلے لگا لینے کو جی چاہتا ہے ؎

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی　　　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اچھی زندگی کا مفہوم یہی ہے کہ تعذیب کے تجربے سے گذر کر تہذیب حاصل کرے، تعذیب یعنی عذاب جھیلے بغیر وہ تزکیہ و تہذیب یعنی نکھرنے اور سنور جانے کی انتہائی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتی، حضورؐ مکّی تھے، صحابہؓ کا تزکیہ نفس صرف اس وقت ممکن ہوا جب مصیبتوں اور دکھوں کی آگ نے ان کی زمانۂ جاہلیت کی ہر آلائش کو جلا کر راکھ کر دیا اور انہیں کندن بنا دیا۔

شاہ جی مرحوم بھی برطانوی حکمرانوں کے گوناگوں تشدّد کا مسلسل نشانہ بنے، پے در پے گرفتاریوں، پے در پے مقدموں، مسلسل قید و بند، مسلسل طوق و سلاسل کی اذیتوں کے مرحلوں سے گذرنے کے علاوہ قاتلانہ حملے ان پر ہوئے، زہر انہیں دیا گیا، قتل میں ملوّث کرنے کی پوری سازشیں کی گئیں۔ تقریر کے موقع اور مقام پر پہلے سے فائرنگ کر کے خوف و ہراس پھیلانے کی کوششیں عمل میں لائی گئیں، تقریر کے لئے جس راستے سے گذر کر جانا تھا وہاں فرنگی فرمانرواؤں اور ان کے گماشتوں کی طرف سے غنڈے گھات میں بٹھائے گئے تاکہ شاہ جی اور ان کے ساتھیوں کو خوف زدہ کیا جا سکے ـــ اذیتوں کے ان تمام تجربوں کو شاہ جی نے اپنے لئے تزکیۂ باطن اور تہذیبِ نفس کا ذریعہ بنایا، ۲۱-۱۹۲۰ء میں جب ایک پہلے مقدمہ میں مجسٹریٹ کی طرف سے حبسِ دوام کی سزا متوقع تھی اور سزا صرف تین سال قید بامشقت کی سنائی گئی تو شاہ جی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

دار کے حق دار کو یہ قیدِ سہ سالہ ملے
ہائے مشکل تھی جو آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

آگے جیل میں منتقل کرنے کی روداد جانباز مرزا کے اپنے الفاظ میں سنئے:

"گاڑی چلنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ شاہ جی کو اسٹیشن پر لایا گیا

پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑی، اس حالت میں یہ مردِ درویش جب اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو پتھر بھی آبدیدہ ہو گئے، برطانوی سامراج کا مجرم، وطن کا سپاہی، قرآن کا مبلغ آزادیٔ وطن کے جرم میں آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا، قیدیوں کی ویگن میں بیٹھنے کے لئے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا ع

عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا"

یہ عشق کیا تھا؟ شاہ جی کے ہاں یہ عشق، عشق رسالت تھا جس کی آتش سوزاں میں وہ عمر بھر جلے، دراصل یہی عشق تھا جس نے ان کی زندگی کو موجِ تند جولاں بنا دیا تھا، یہی سوز عشق رسالت تھا جس سے ان کی تقریریں لبریز ہوتی تھیں، اسی عشق رسالت کی آگ تھی جس کی وجہ سے وہ کبھی تحریک ختم نبوت، کبھی تحریک احرار، کبھی تحریک خلافت وغیرہ کی سرگرمیوں میں شریک ہو کر ہمیشہ فیصلہ کن کردار ادا کرتے رہے، ان کے ہاں عشق رسالت اگر نہ ہوتا تو وہ مرزائیت کے خلاف دفاعِ رسالت اور تحفظِ نبوۃ کا عظیم کام کیسے سرانجام دے سکتے تھے؟

شاہ جی مرحوم سنتِ ابراہیمی کی پیروی میں ساری عمر بتانِ آذری کو پاش پاش کرتے رہے۔ کیسے کیسے بت تھے جو انہوں نے توڑے، فرنگی استعمار اور معاشی استحصال کے بت، قادیانیت اور چکڑالویت کے بت، جاہلی رسوم و رواج کے بت، شرک و بدعات کے بت، ملمع ساز پیرانِ پارسا کی پارسائی کے بت سیاست کے جعلی سکہ سازوں کے بت، بت شکنی کا یہ سارا عمل انہوں نے لا الٰہ کی تیغِ براں سے سرانجام دیا۔ لا الٰہ نے انہیں ہر طاغوتی طاقت سے انکار پر ابھارا، سارے بتوں سے یہ انکار دراصل ایک خدا کی ہستی کے اقرار کے لئے تھا۔ انہوں نے عمر بھر یہ نعرۂ توحید و تکبیر بلند کیا کہ ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری،

شاہ جی اپنی شخصیت کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھے، سپرمین تھے، ان کی مردانہ وجاہت اور شوکت اور ان کی آواز کے انتہائی سریلے زیر و بم نے نہ جانے کن کن لوگوں کے اندر چپکے چپکے ان کے لئے احساسِ پرستش ابھارا ہوگا، ان کی خطیبانہ سحر انگیزی ناقابل مزاحمت اثر کی حامل تھی، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی آواز نے معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کو متاثر کیا، سماج کا پنجلہ طبقہ بھی ویسے ہی متاثر ہوا جیسے متوسط اور اعلیٰ طبقہ، تینوں کے تینوں طبقوں کے وہ تمام مرد و زن خواہ مسلمان تھے، ہندو تھے، سکھ تھے یا عیسائی، جو بھی بحیثیت سامع ان کی آواز کے غیر معمولی ارتعاش کی زد میں آیا وہ کوشش کے باوجود متاثر

اور مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بعض اوقات محتسب قوت، ان آہنی سلاسل کو زمین پر پھینک کر شاہ جی کے قدموں پر گر گئی۔ جنہیں وہ شاہ جی کی گرفتاری کے لئے اپنے ہمراہ لائی تھی۔

اس خطیبانہ اثر انگیزی اور فسوں سازی میں پورے ہندوستان میں بہ شمول ابوالکلام آزاد کوئی بھی ان کا ہم پلہ نہیں۔ ابوالکلام آزاد کی خطابت کا دائرۂ اثر زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں تک محدود تھا۔ دیہات کے جاہل اور گنوار لوگوں تک تو نہ مولانا مودودی کی رسائی تھی نہ ابوالکلام آزاد کی۔ ان غریب انسانی آبادیوں پر تو صرف امیر شریعت کی تابناک آواز کا پرچم لہراتا تھا۔ شخصی اثرات کی اس گہرائی اور گیرائی کو ناپنے کا ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں۔ شخصی اثرات کو مقداروں اصطلاحوں یعنی منوں اور سیروں میں تو ظاہر نہیں کیا جا سکتا، اثرات کیفیتی ہوتے ہیں نہ کہ کمیتی۔ تو پھر آئیے یہ بات مان لیں کہ جو کام آج تک بعض پوری مذہبی جماعتیں نہیں کر سکیں وہ تنہا شاہ جی مرحوم نے سر انجام دیا۔ کاش ان لامحدود داخلی اثرات کو پوری طرح خارجی طور پر متحد اور منتظم کرنے کا کام بھی سر انجام پا جاتا۔

امیرِ شریعت رحمہ اللہ عظمتوں کا ایک جہان تھے۔ بصرتوں کی ایک کائنات تھے۔

اس جہان اور اس کا احاطہ میرے بس میں نہیں؛

شاہ جیؒ کے جذبۂ انقلاب اور ان کے ذوقِ اصلاحِ دعوت کی کئی جہتیں ہیں۔ لیکن ایک جہت انتہائی بنیادی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سرزمین ہند پر فرنگی تسلط و فرمانروائی کو توڑنے کے لئے ان کی باغیانہ آواز نے فضاؤں میں جو تھرتھراہٹیں پیدا کیں، ان کے اثرات بڑے فیصلہ کُن ثابت ہوئے، مسلمانانِ ہند کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرنے کے لئے انہوں نے نہایت مؤثر کردار ادا کیا، شاہ جی ہماری داستانِ حُریت آزادی کے اہم ہیرو تھے۔

مستقبل کا مؤرخ کوئی ابن بطوطہ، کوئی البیرونی، کوئی ابن خلدون، کوئی بلاذری، کوئی مسعودی، کوئی غلام رسول مہر، کوئی معین الدین ندوی اور کوئی شیخ اکرام الحق ـــــــ گردشِ روزگار کی کسی سازگار کروٹ کے ساتھ جب بھی جنم لے گا تو وہ یہ طے کر سکے گا کہ شہاب الدین سہروردی، اور بہاء الدین زکریا ملتانی، وجیہہ الدین عراقی، شیخ الاسلام صدر الدین عارف، شاہ رکن عالم رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان جیسے تمام عارفانِ حق سے ملنے والی مسلسل اور تابناک زنجیر میں امیرِ شریعتؒ کا کیا مقام ہے، وہ عارف باللہ تھے۔ ایک عارف کی حیثیت سے شاہ جی مرحوم ایسا قطبی ستارہ تھے جنہیں دیکھ کر ان کے عہد کی انسانی نسلیں اپنی سمتِ سفر کو درست کرتی رہیں۔ ـــــ بقیہ ص ۴۸ پر دیکھیں ـــــــ

میاں محمد شفیع
(سابق پبلک ریلیشنز آفیسر)
راولپنڈی

سحر البیان خطیب

بچپن سے ہی میں مذہبی جلسوں میں جایا کرتا تھا اور مواعظِ حسنہ سے مستفیض ہوتا۔ کئی علماء کرام کو سننے کو اتفاق ہُوا لیکن جو کیف و سرور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سے حاصل ہوتا وہ دیگر مواقع پر کم ہی نصیب ہُوا۔ اگرچہ اور علماء بھی علمی اعتبار سے بحرِ بیکراں تھے لیکن تقریر کرنے کا ملکہ ایک قدرتی عطیہ ہے

ع یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی شخصیت بڑی رعب دار تھی۔ گھنی داڑھی، گندمی رنگ، مناسب جسم، کشادہ چہرہ، ہاتھ میں اکثر عصا رکھتے۔ آواز سوز سے معمور تھی۔ اگر کسی وقت لاؤڈ سپیکر خراب ہوجاتا تو آپ کی آواز اتنی اونچی اور پاٹ دار تھی کہ دُور بیٹھے ہوئے سامعین کو بھی صاف سنائی دیتی۔

جب تقریر کرتے وقت قرآن پاک کی آیات کی تلاوت کرتے تو مجمع پر سکوت طاری ہوجاتا اور لوگ عش عش کر اٹھتے۔ ہر ایک یہی چاہتا کہ مولانا قرأت جاری رکھیں اور وہ سنتے رہیں۔ فرمایا کرتے میری عمر کا بہت سا حصہ جیل میں گزرا یا ریل کے سفر میں۔ عمر بھر تحریک تحفظ ختم نبوت کے زبردست داعی رہے۔ اپنے مسلک پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ اس راہ میں قید و بند کے مصائب خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلے۔ یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ جو نصب العین عمر بھر ان کے پیش نظر رہا۔ بالآخر مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے پر منتج ہوا۔ اس طرح وہ جدوجہد جو عرصہ سے جاری تھی اور جس کی خاطر شمع رسالت کے بے شمار پروانوں نے جانوں کے نذرانے پیش کئے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ایک دفعہ حاضرین کے سامنے اپنا اور مرزا غلام احمد قادیانی کے کردار کا موازنہ پیش کیا۔ فرمایا کہ اگر مرزائی حضرات ایسے کردار کے مالک شخص کو نبی ماننے پر مُصر ہیں تو پھر انہیں نعوذ باللہ نعوذ باللہ مجھے خدا ماننا پڑے گا۔ فروعی مسائل میں الجھنا پسند نہ کرتے۔ ایک شخص نے استفسار کیا کہ کیا مُردہ افراد سنتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ مُردوں کا کیا ذکر ہماری بات تو زندہ بھی نہیں سنتے۔

تقریر کرتے وقت سامعین کو رلاتے اور ہنساتے بھی۔ کئی معروف شعرائے کرام کے اشعار یاد تھے۔ تقریر کے دوران جہاں جہاں موضوع سخن تقاضا کرتا مناسب اشعار سناتے۔ اس سے ان کی تقریر کی چاشنی دگنی ہوجاتی۔

بذلہ سنج اور حاضر دماغ تھے۔ دہلی میں ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے کہ سامعین میں سے ایک نے اٹھ کر

پوچھا کہ مولانا آپ نے جو پچھلے سال کلکتہ کے قحط زدگان کے لئے چندہ جمع کیا تھا اس کا حساب دیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم سے حساب کا تقاضا ایسے حضرات کرتے ہیں جنہوں نے بذات خود کسی نیک کام کے لئے ایک دھیلا بھی نہیں دیا ہوتا۔ سوال کنندہ سے کہا کہ وہ حلفاً بیان کرے کہ اس نے کتنا چندہ دیا تھا۔ اس پر وہ خاموش رہا اور کھسیانا ہو کر بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہم حساب دیں گے ضرور لیکن قیامت کے دن احکم الحاکمین کو۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

لاہور میں موچی دروازہ کے باہر ایک پُر ہجوم جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ لاہوریو! میں تم سے خوب واقف ہوں۔ تقریر تم میری سنتے ہو اور ووٹ مسلم لیگ کو دیتے ہو۔ میری تقریر پر تعریف کے ڈونگرے برساتے ہو اور کہہ اٹھتے ہو واہ اور جب میں پابند سلاسل کیا جاتا ہوں تو تم کہتے ہو آہ۔ اس آہ اور واہ میں میں ہو گیا تباہ۔ (لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہماری آہوں اور جہد مسلسل سے کتنوں کے مقدر سنور گئے) گویا۔۔۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

ایسا کئی بار ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز عشا کی نماز کے بعد کیا اور جب سحر کی اذان فضا میں بلند ہوئی تو آپ نے اپنا بیان ختم کیا۔ اس طویل دورانیے میں مجمع سحر زدہ رہتا اور ان کی تقریر سننے میں اتنا محو کہ بوریت یا نیند اس کے نزدیک نہ پھٹکتے۔

خفیہ پولیس کا سٹاف سایہ کی طرح ان کے تعاقب میں رہتا۔ ایک مرتبہ کسی گاؤں میں تقریر کرنے جا رہے تھے۔ ٹانگے پر ایک اور شخص ان کا ہمسفر تھا شاہ صاحب نے بھانپ لیا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ جب ٹانگے سے نیچے اترے تو اس شخص سے کہا کہ کتابوں کا بھاری بنڈل جو وہ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں پیرانہ سالی کے سبب وہ اسے اٹھانے سے معذور ہیں۔ اس لئے کیا ہی اچھا ہو اگر وہ اسے اٹھا لے اور فلاں گاؤں تک جو وہاں سے تین میل دور ہے پہنچا دے۔ اس نے بادل نخواستہ حامی بھر لی۔ جب منزل مقصود پر پہنچے تو ساتھی تھکاوٹ کے مارے نڈھال ہو چکا تھا۔۔۔

جب مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو شاہ صاحب نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ اور ان کی جماعت اس نوزائیدہ اسلامی سلطنت کا دل و جان سے دفاع کریں گے۔

مولانا نے طویل عمر پائی جب انتقال فرمایا تو ان کے جسد خاکی کو ملتان کی سرزمین نے جس میں اور بھی کئی علم و معرفت کے درخشندہ ستارے آسودہ خاک ہیں اپنی آغوش میں لیا۔

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

("صدف ریزے" صفحات ۸۶ تا ۸۹)

شاہ محمد عثمانی
انڈیا

سپاہی بھی، سپہ سالار بھی

مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری کی جدوجہد آزادیٔ وطن اور اقامت دین کے لئے رہی، مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے انگریزوں سے معرکہ آرا رہے اور اس وجہ سے زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں گزارا۔ جب جیل سے نکلتے تو ان کی شعلہ بیانی کی بدولت قصرِ حکومت میں زلزلہ آجاتا۔ وہ ملک کے طول و عرض میں سفر کر کے اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے اور پھر حکومت کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہتا کہ انہیں بند کردے۔ اس طرح یہ فقرہ ان کے مناسب حال ہے کہ ان کی آدھی زندگی جیل میں گزری اور باقی زندگی ریل میں۔

مولانا نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ کی، بلکہ کشمیر کے پژمردہ مسلمانوں کو اٹھانے میں بھی انہوں نے زبردست حصہ لیا۔ جس وقت شیخ عبداللہ اندرونِ کشمیر میں مہاراجہ کی زبردست طاقت سے لڑ رہے تھے، اس وقت پنجاب اور دیگر صوبوں سے مولانا نے اپنی شعلہ بیانی کے ذریعہ ہزاروں رضاکار جمع کر کے کشمیر بھیجے، تاکہ مہاراجہ کی طاقت سے ٹکر لی جائے۔ مہاراجہ نے مجبور ہو کر حکومت ہند سے مدد طلب کی، حکومت ہند نے مدد تو کی اور اپنی فوج کشمیر کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بھیج دی، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کمیشن مقرر کردیا۔ جسے ایجی ٹیشن کے اسباب پر اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ کمیشن نے رپورٹ دی کہ ریاست کے عوام کی حکومت میں کوئی آواز نہیں ہے اور برطانوی ہند میں رفتہ رفتہ اصلاحات نافذ ہورہی ہیں، ان کے اثر سے کشمیر کے عوام بھی خواہش مند ہیں کہ ان کے یہاں بھی اس طرح کی اصلاحات ہوں، چنانچہ برطانوی حکومت کے دباؤ سے کشمیر میں اصلاحات کی بنیاد پڑ گئی۔ اسی طرح شاہ صاحب نے اپنی پُرزور کوششوں سے پاکستان میں قادیانیوں کا زور بھی توڑ دیا۔ گرچہ اب بھی پاکستان میں قادیانی مضبوط ہیں لیکن پہلے کے مقابلہ میں ان کے اثرات کم ہیں۔ اس از بر آرائی زبان و قلم میں مولانا اور ان کے رفقاء دار و رسن کی منزل کے قریب پہنچ گئے تھے۔

آزادی سے پہلے ہندوستان میں مولانا کی شخصیت معروف اور مسلم تھی، وہ جہاں بھی پہنچ جاتے ان کے مخالفین بھی ان کی تقریر سننے آجاتے، وہ گھنٹوں بھی بولتے رہتے تو لوگ مسحور ہو کر سنتے رہتے، فیاضِ ازل نے گفتگو اور تقریر کی غیر معمولی قدرت سے انہیں نوازا تھا۔ مولانا ایک اجتماع میں پنجاب کے امیر شریعت منتخب ہوئے تھے، لیکن ان کی ہنگامی زندگی نے ان کو موقع نہیں دیا کہ اپنی امارت کو منظم کریں۔ یہ ایک تقدیری بات تھی ورنہ امارت شرعیہ ہندوستان گیر پیمانہ پر بن چکی ہوتی۔ مولانا تھے تو پنجاب کے، لیکن ان کی نانہاں پٹنہ سٹی میں تھی، انہوں نے اپنے لڑکپن کا حصہ اور عنفوان شباب تک کا زمانہ "گیا" میں گزارا۔ پٹنہ میں ان کے رشتہ دار اور "گیا" میں ان کے جاننے والے موجود تھے۔

مولانا کا حافظہ غضب کا تھا۔ ۳۰ء کا زمانہ تھا کہ وہ "گیا" آئے، جامع مسجد پہنچ کر وہ تحیۃ المسجد پڑھنے لگے،

سامنے ایک آدمی آ کے کھڑا ہوا جو بہت معمولی شکل و صورت اور معمولی لباس میں تھا مولانا نے سلام پھیر کر اس سے معانقہ کیا اور کہا کہ آپ کو چالیس برس کے بعد دیکھا ہے" جب کہ ان کا لڑکپن تھا۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا کا تعلق ہندوستان سے نہیں رہا، لیکن ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں خان عبدالغفار خان، مولانا عبیداللہ سندھی کی طرح مولانا کے نام کو بھی بھلایا نہیں جاسکے گا۔

مولانا کو میں نے "گیا" میں قریب سے دیکھا تھا، ان کی جرأت اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں ان کی مجاہدانہ زندگی اور غیر مصالحانہ روش مجھ سے کہتی تھی کہ تو بھی نہ ڈر اور بے خطر اس آتش نمرود میں کود جا۔ مولانا نے جس طرح ساری زندگی جہادِ آزادی میں گزاری اور مسلسل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی ہے۔ وہ آزادی کی لڑائی کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی اور تنہا لشکر جرار بھی، ان کے نفس گرم کی تاثیر نے ہزاروں اشخاص کے دلوں میں آزادی کا جوش بھر دیا۔ اس دور کو دیکھنے والی نسل بھی اب تیزی کے ساتھ ختم ہوتی جارہی ہے، رہے نام اللہ کا۔

"ٹوٹے ہوئے تارے" (صفحات ۱۳۶ تا ۱۳۸)

دُعائے مغفرت

- ادارہ نقیبِ ختم نبوت کے بہت ہی مخلص مُعاون جناب حامد سراج صاحب (خانقاہ سراجیہ) کے ماموں گذشتہ دنوں انتقال کر گئے۔
- مجلس احرارِ اسلام چیچہ وطنی کے کارکن جناب محمد شفیع اور محمد اکرم کے نانا پچھلے دنوں وفات پا گئے۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر عطا فرمائے (آمین) اراکینِ ادارہ لواحقین کے غم میں شریک ہے۔

قارئین سے گذارش ہے کہ وہ ہر دو حضرات کی مغفرت کے لئے خصوصی دعاؤں کا اہتمام فرمائیں (ادارہ)

آپ کے عطیّات: محاسبۂ مرزائیت و رافضیت کی جدوجہد کو تیز تر کرنے کے لئے اپنی زکوٰۃ، صدقات اور عطیات اپنی جماعت مجلسِ احرارِ اسلام کو دیجئے

بذریعہ منی آرڈر :- سید عطاء المحسن بخاری مدظلہٗ، دارِ بنی ہاشم، مہربان کالونی، ملتان

بذریعہ بنک ڈرافٹ یا چیک :- اکاؤنٹ نمبر ۲۹۹۳۲ حبیب بنک حسین آگاہی، ملتان

حضرت مرزا محمد حسن چغتائی رحمہ اللہ

حضرت امیرِ شریعتؒ مولانا عبدالرحمٰن میانویؒ کی نظر میں

حضرت مرزا محمد حسن چغتائی رحمہ اللہ نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل ذیل کی تحریر ادارہ کو ارسال فرمائی تھی، مگر افسوس کہ وہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی ۱۲ر اپریل ۱۹۹۲ء کو آخرت کو سدھار گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے (آمین)

۲۱ر اگست کو حضرت امیرِ شریعتؒ کے یومِ وفات کے حوالہ سے یہ تحریر نذرِ قارئین کی جا رہی ہے (ادارہ)

خلد آشیانی حضرت مولانا عبدالرحمٰن میانوی مرحوم و مغفور کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میرے طالب علمی کے زمانہ میں ۴۲-۱۹۴۰ء میں جمعیۃ المسلمین کہروڑ پکا (جس کے ماتحت ایک پرائمری سکول اور یتیم خانہ چل رہا تھا اور ہمارے جماعتی استاد حاجی ابوظفر نور محمد مرحوم اس کے روحِ رواں تھے) کے تبلیغی اجتماعات میں شرکت کے لئے مولانا ظہور احمد بگویؒ کے ہمراہ تشریف لایا کرتے تھے۔ پھر قدرت نے ہمیں مجلس احرار اسلام میں ایک ساتھ کام کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ تو مخلصانہ تعلقات کا ایک غیر منتہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ جو ان کے دمِ واپسیں تک قائم رہا۔

۲۲ر جون ۱۹۶۹ء کو موصوف نے اپنی شدید بیماری کے دوران کراچی سے مجھے ایک ذاتی نوعیت کا گرامی نامہ تحریر کیا۔ اس میں شاہ جیؒ کا تذکرہ جس والہانہ انداز سے کیا گیا ہے اگر میں اسے اپنی احرار برادری سے اوجھل رکھوں تو یہ شاہ جیؒ کی ہمہ صفت شخصیت سے ناانصافی کے مترادف ہو گا۔ جب کہ اس وقت حضرت امیرِ شریعتؒ کے کئی ایک سوانحی خاکے زیرِ ترتیب ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن میانویؒ لکھتے ہیں:

"میں اب کہ رجب میں بیمار ہوا۔ جیچہ وطنی میں جماعتی خطابت تھی۔ وہاں علاج کرتا رہا مگر آرام نہ آیا شعبان میں ملتان آیا اور حکیم خلیل صاحب جو آبائی طور ہمیشہ حکمت کرتے ہیں سے علاج کرایا، انہوں نے غلط مرض سمجھ کر علاج کیا۔ مجھے ۱۹۵۱ء میں تپ محرقہ ہوا تھا اس کی وجہ سے معدہ آنتیں خراب ہو چکی تھیں۔ تین سال متواتر بیکار رہا ایک سال تو بخار دامن گیر رہا۔ ۱۰۶ ٹمپریچر اور اسہال کی کثرت! مگر قدرت نے بچا لیا۔ اس وقت میرے محسنِ اعظم میرے مربّی اعلیٰ حضرت امیرِ شریعتؒ سر پر کھڑے علاج کرا رہے تھے۔ قصبہ میانی میں تین دفعہ تشریف لائے، تین دن تک غریب کدہ پر قیام فرمایا

بچیوں بیٹوں کے سر پر روانگی کے وقت ہاتھ رکھ کر کہا کہ "میرے پاس حیات کا انجکشن نہیں کہ میانوی کو لگا دوں ۔! خدانخواستہ میرے منہ میں مٹی پڑے اگر یہ مرگیا تو اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھنا میں بخاری تمہارا ابا جب تک زندہ ہوں تمہاری حال پرسان کرتا رہوں گا اور اپنی عزیزہ صادقہ کی طرح سمجھوں گا۔" تمام ادویات کا خرچہ اپنی جیب سے دیا، پھر ملتان آیا تو حکیم عطاء اللہ صاحب سے مقویات کھلائیں، ذاتی خرچہ دیا جماعت کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیا۔ بچی ہمیشرہ کا نکاح ہوا۔ بحیثیت باپ شرکت کی۔ ہر قسم کی اعانت فرمائی۔ آہ! آہ! ثم آہ!! ثم آہ!!!

ملک تقسیم ہوا، ملتان تشریف فرما ہوئے ختم نبوت مجلس کی بنیاد پڑی۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب، مولانا لعل حسین اور مجھے ارشاد فرمایا کہ "عمر وقف کردو اور کچھ مشاہرہ مقرر کرلو" میں نے عرض کیا۔ جوانی صحرا نوردی، شہروں، قصبات، دیہات میں بلا معاوضہ لگا دی۔ اب بوڑھاپے میں مول ڈالیں، میری غیرت گوارا نہیں کرتی پھر جاہیں مقرر کردیں ہمارے حالات آپ سے مخفی نہیں" بدقسمتی سے ختم نبوت اور مجلس احرار میں تعاون نہ ہونے سے پرانے ساتھی خصوصاً آپ جیسے مشفق، مخلص دوست بچھڑ گئے۔ اگرچہ ملاقات ہوتی رہی مگر وہ سابقہ رفاقت اور یگانگت ہے کہاں ۔!

والسلام
عبدالرحمٰن میانوی

دُعائے صحت

- حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کے قدیم رفیقِ سفر اور مجلس احرارِ اسلام چکڑالہ کے رہنما جناب کپتان غلام محمد صاحب کے بیٹے ٹریفک کے حادثہ میں زخمی ہو گئے ہیں۔
- ہمارے عزیز ترین اور مخلص دوست جناب عبدالشکور صاحب (پی آئی ۔ اے مُلتان) کی والدہ ماجدہ شدید علیل ہیں اور نشتر ہسپتال ملتان میں زیر علاج ہیں ● حضرت امیرِ شریعتؒ کے قدیم ساتھی، مجلس احرارِ اسلام کے بزرگ رہنما اور تحریکِ آزادی کے جاں نثار کارکن جناب جانباز مرزا ان دنوں سخت علیل ہیں اور میو ہسپتال لاہور میں زیرِ علاج ہیں۔
- ابن امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری مدظلہٗ اور ان کی اہلیہ علیل ہیں۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ ان تمام مریضوں کی صحت وسلامتی کے لئے خصوصی دعاؤں کا اہتمام فرمائیں ۔ (ادارہ)

برطانوی سیاست و ثقافت کے خلاف ہم سب مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے والے بے مثال خطیب اور مجاہد سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی آواز ہر آن میرے ایمان میں شامل ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

پرانے لشکرِ اسلام کے بچھڑے ہوئے غازی
ترے دم سے ہے قائم سرفروشی اور سر بازی
تیری صورت سے مردانِ خدا کی یاد تازہ ہے
غلامانِ محمد مصطفیٰ کی یاد تازہ ہے
تیری سیرت سے عابد اور زاہد یاد آتے ہیں
بصیرت سے مدبر اور مجاہد یاد آتے ہیں
وہ شعلہ جس سے داغِ عشق کی گرمی ہویدا ہے
تیری صورت سے ظاہر ہے تیری سیرت سے پیدا ہے
صداقت ڈھونڈتا ہوں جب فدا کاری کی راہوں میں
تری تصویر پھرتی ہے تصوّر کی نگاہوں میں
مرے دل میں یہ شمعِ قوم کا پروانہ زندہ ہے
حسین ابن علی کا اسوۂ مردانہ زندہ ہے

حفیظ جالندھری ——— (چراغِ سحر صفحہ ۱۹۲)

امیرِ شریعتؒ کی یاد میں

سید عطاء المحسن بخاری

کہاں گیا جو بہاروں کی بات کرتا تھا
بڑے لطیف اشاروں کی بات کرتا تھا
وہ تیرے وعدے پہ تب سے تھا رہگزر کے قریں
نہ مانگتا نہ سہاروں کی بات کرتا تھا
غریبِ شہر بھی دل کی کہے گا اس سے کبھی
بڑا کریم تھا پیاروں سے بات کرتا تھا

وہ جس کے فکر و عمل میں فرشتگی تھی اسیر

بساطِ وقت سے افسوس اُٹھ گیا وہ خطیب
مزاجِ عصر کا جو عُمر بھر طبیب رہا
وہ جس کے فکر و عمل میں فرشتگی تھی اسیر
تمام عُمر وہ اخلاص کا نقیب رہا
ہیُولہ بَن کے جھپٹتا رہا جو باطل پر
مُخالفت کے ہر اِک جبر کا رقیب رہا
یہ واقعہ ہے کہ جس نے سُنا نہ اُس کا سخن
حُصولِ علمِ بصیرت میں کم نصیب رہا

◇

تھا اُس کا قلب، حریمِ صفات کا محرم
خلوصِ عشقِ محمدؐ کی سلسبیل لئے
وہ اِک شعورِ مجسّم تھا، عظمتِ دیں کا
حق آگہی کی شکیبائی جمیل لئے

شکوہ و عظمتِ ملّت کا پاس دار رہا
سُخن تھا اُس کا تبِ تابشِ جلیل لئے

◇

وہ اُسکی سحر بیانی، وہ اس کا صدق و خلوص
تلاش کرتا تھا خود شاہد مقال اُسے
گزُر گیا جو ہر اک موڑ کاٹ کر غم کا
ڈرا سکا نہ کبھی موت کا جلال اُسے
نگل سکی نہ جسے صرصرِ حوادث بھی
خدا نے بخشا تھا وہ دردِ لازوال اُسے
ستیزہ کار رہا شاطرِ فرنگی سے
تمام عُمر رہا قوم کا خیال اُسے
اُتر گیا جو دلِ قوم میں لہو بن کر
نہ کر سکے گی کبھی موت پائمال اُسے

◇

ماخوذ "تابندہ و پائندہ شخصیتیں" سنہ ۱۹۶۸ء
سید محمد قاسم نوری

بروصال امیر شریعت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ

رفت از جہاں بخاری یکتائی ایں زمن — آں تابع کتاب و آں پیرو سنن
آں صاحبِ فرست آں صاحبِ فطن — سر چشمۂ شرافت، افعالِ اوحسن
آں غازی و مجاہد درِ راہ ذوالمنن — آں سرفروشِ ملت آن زبدۂ وطن
بنیاں کن فرنگی ہم مرزا شکن — ازہیبِ او لرزہ درقلب برہمن
دیگر چو او نزاید از خاک ایں وطن — سحرالبیان لبانش گوہر فشاں دہن
دائم گزیدہ غزلت اردار پر محن — شد گور خانۂ او پیرانہش کفن
گل شد چراغِ خانہ شمع انجمن — یا باغبان جُدا شد از سبزۂ چمن
چوں کرد روح پاکش پرواز زبدن — دادہ سروشِ غیبی ایں مُژدہ بمن

"اللہ کردہ جائیش در جنتِ عدن"

۱۳۸۱ھ

عطاء اللہ خان عطار مرحوم (گنڈا پور)
ڈیرہ اسمٰعیل خان

پیکرِ حُرّیت واستقامت

حادثے اٹھے، زمیں کانپی فلک چکرا گیا
کوہساروں کی جبینوں پر پسینہ آگیا
رہنما ایسا کہ مالا بار سے لاہور تک
ہر کسی پیر و جواں کے قلب کو گرما گیا

(شورش کاشمیری)

پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی

اقبالؒ کے حضور میں

قادیانی سر ظفر اللہ کے خلاف علامہ سے ایک بیان لینے کی دلچسپ کہانی

مارچ ۱۹۳۷ء کا ایک دن میری زندگی میں ایسی یادگار حیثیت اختیار کر گیا کہ اس کی یادوں کی چاندنی آج بھی میرے افکار اور محسوسات کی دنیا کو جگمگائے ہوئے ہے ۔ یہ وہ دن تھا جب مجھے زندگی میں پہلی بار نا بغہ روزگار حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے حضور حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ۔

میں ان دنوں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملت اسلامیہ کے دلوں میں قادیانیوں کے دل آزار معتقدات اور ژاژ خائیوں کے باعث بے زاری کا ایک طوفان برپا تھا ۔ پنجاب میں انجمن حمایت اسلام نے اپنے ایک تاریخی اجلاس میں جو علامہ اقبالؒ کی صدارت میں ہوا تھا ' قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیتے ہوئے انجمن کے اداروں سے الگ کر دیا تھا ۔ پنجاب کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی طلبہ نے

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے اور یونیورسٹی کے اداروں سے الگ کر دینے کا مطالبہ کر رکھا تھا ۔ اس سلسلے میں مولانا ظفر علی خانؒ اور سید عطا اللہ شاہ بخاری جیسی قومی شخصیات کی تقریریں یونیورسٹی میں گونج چکی تھیں اور طلبہ میں زبردست ذہنی ہیجان برپا تھا کہ اچانک یہ انکشاف طلبہ پر برق بن کر گرا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے سر ظفر اللہ خان قادیانی کو کانووکیشن ایڈریس پڑھنے کی دعوت دی ہے جسے موخر الذکر نے منظور کر لیا ہے ۔ سر ظفر اللہ خان ان دنوں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے اور اس حیثیت میں بہت اثر و رسوخ کے مالک تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کے زبردست احتجاج کے باوجود مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے تھے ۔

یہ خبر یونیورسٹی کے ان طلبہ پر برق بن کر گری جو یونیورسٹی سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کے لئے سرگرم عمل تھے ' چنانچہ طلبہ نے باہم مشورے سے فیصلہ کیا کہ وہ سر ظفر اللہ کی یونیورسٹی آمد پر زبردست مخالفت کریں گے ۔ قاری محمد انوار صمدانی ' محمد شریف چشتی ' سردار عبدالوکیل خان اور راقم الحروف نے مل کر طے کیا کہ اس تحریک کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ سے رجوع کیا جائے ۔ مسلم اخبارات الجمعیت ' زمیندار وغیرہ میں اداریے اور شذرات لکھوائے جائیں ' چنانچہ ان اخبارات نے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے اس فعل کی مذمت کی کہ ان کی دعوت پر سر ظفر اللہ مسلم یونیورسٹی کے جلسہ انعامات سے خطاب کریں اور طلبہ میں اسناد تقسیم کریں ۔

تمام ساتھیوں کے مشورے سے راقم الحروف علامہ اقبالؒ سے ملاقات کے لئے لاہور

روانہ ہوا ۔ علامہ ان دنوں جاوید منزل میں مقیم تھے ۔ جاوید اقبال ابھی بچے تھے ۔ میں سہ پہر کے وقت جاوید منزل پہنچا اور علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ وہ ان دنوں بیمار تھے اور ملاقات کی اجازت خاص خاص لوگوں کو تھی ۔ جب میں نے اطلاع بھجوائی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ کا پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں تو فوراً ہی اذن باریابی مل گیا ۔

علامہ اقبالؒ ہال نما کمرے کی ایک جانب ایک بغلی کمرے میں چارپائی پر تشریف فرما تھے ۔ سامنے چند کرسیاں موجود تھیں اور شلوار قمیص کے سادہ لباس میں ملبوس تھے ۔ ایک طرف بڑا تکیہ رکھا ہوا تھا ۔ راقم الحروف نے علامہ کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور اس سلسلے میں وہ استفتاء بھی دکھایا جو دہلی میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید سے قادیانیوں کی بابت حاصل کیا تھا جس پر لاہور سے مولانا احمد علی اور مولانا سعید داؤد غزنوی کے دستخط لئے گئے تھے ۔ علامہ نے ساری صورت حال سے آگاہی کے بعد مجھے ہدایت فرمائی کہ فضل کریم درانی سے ملوں ، جو ہفتہ وار اخبار ٹرتھ (Truth) کے ایڈیٹر تھے ، اور ان سے میمورنڈم (یادداشت) تیار کروا کر ٹائپ کرا کے لاؤں ۔

راقم الحروف عرب ہوٹل پہنچا جہاں ان دنوں فضل کریم درانی مقیم تھے ۔ میں نے ان سے میمورنڈم تیار کرا کے ٹائپ کروایا اور حسب ہدایت اگلے روز دوبارہ علامہ کے نیاز حاصل کئے ۔ علامہ اقبالؒ نے اس پر دستخط کر کے مجھے ہدایت کی کہ اس پر مولانا ظفر علی خانؒ کے دستخط حاصل کروں ، چنانچہ میں نے مولانا ظفر علی خان اور دیگر اکابر ملت کے دستخط حاصل کئے ۔ اس طرح میمورنڈم کے ایک طرف علماء کا فتویٰ تھا اور دوسری جانب بہ زبان انگریزی "میمورنڈم" درج تھا ۔ یہ میمورنڈم جملہ ارکان انتظامیہ کو بھیج دیا گیا اور اہم اداروں اور اخبارات میں تقسیم کیا گیا ۔ علامہ کی رائے ملت کی نگاہوں میں انتہائی اہم سمجھی جاتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ کا بیان اخبارات نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا اور ہفتوں کی صورت میں بھی اشاعت پذیر ہوا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ظفر اللہ کو بطور مہمان خصوصی بلائے جانے کا فیصلہ منسوخ ہو گیا ۔

دوران ملاقات علامہ اقبال نے مجھ سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ساری صورت حال معلوم کی اور طلبہ کے نام پیغام دیا کہ وہ اشتراکیت اور قادیانیت کی بھرپور مخالفت کریں اور ڈاکٹر سید ظفرالحسن صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ان خدمات کو زبردست سراہا جو وہ مجلس اسلامیات کے پلیٹ فارم سے یونیورسٹی میں سرانجام دے رہے تھے ۔ اور طلبہ کو تاکید کی کہ وہ ان سے فیضان اور راہنمائی حاصل کریں ۔ علامہ نے پروفیسر عبدالستار خیری ، پروفیسر حمیدالدین اور پروفیسر عطا اللہ کا ذکر بھی اچھے انداز میں کیا ۔ اگرچہ اس میمورنڈم کے بعد سر ظفر اللہ کا کانووکیشن ایڈریس منسوخ ہو گیا ، حالانکہ قادیانی اقلیت قرار نہ پا سکے ، البتہ یونیورسٹی میں ان کی عملاً موت واقع ہو گئی ۔

میری ایک ذاتی کتاب پر علامہ اقبالؒ کے ان دنوں کے دستخط بخط انگریزی آج بھی موجود ہیں جو میرے لئے سرمایہ فخر و اعزاز ہیں ۔ علامہ کے ان ولولہ انگیز حقائق و بیان سے ہر طرف غلغلہ مچ گیا ۔ علامہ اقبال سے اس اولین ملاقات کے نقوش آج بھی میرے لوح دل پہ ثبت ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال طلبہ مسلم یونیورسٹی سے جو محبت و عقیدت رکھتے تھے اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ہے ۔ وہ طلبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو قوم کے مستقبل کا

بقیہ صفحہ نمبر 57 پر ملاحظہ کیجئے

معاصر سے انتخاب

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دُھندلی سی اِک تصویر دیکھ

جنرل (ریٹائرڈ) مرزا اسلم بیگ کے تازہ ترین انٹرویو سے اقتباس

س: ایران' افغانستان' پاکستان اور ترکی میں "دفاعی اتفاق رائے" (Strategic Consensus) کا تصور بھی مختلف مواقع پر ابھرتا رہتا ہے۔ آپ خود اس کے پُرجوش پرچارک رہے ہیں' جبکہ ایران کے رویّوں پر گہری نظر رکھنے والے بعض دانشوروں کے خیال میں' اس اشتراکِ عمل کے سلسلے میں ایران سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں؟

ج: اس بات میں بھی خاصا وزن ہے--- اپنا انقلاب' دوسرے ممالک میں برآمد کرنے کے ایرانی جذبے نے متعدد مسلمان ملکوں میں ایران کے متعلق ایک طرح کے مزاحمتی رویّے کو جنم دیا۔ میرے خیال میں ایک اور مسئلہ بھی ہے' یہ کہ آج کے ایرانیوں میں بھی' قبل مسیح کی ایرانی سلطنت--- پرشین ایمپائر--- کا تصور موجود ہے۔ میرے دور میں' ایران کے کمانڈر انچیف محسن رجائی پاکستان آئے تو ان کے پاس' اس پرشین ایمپائر کے نقشے بھی تھے۔ وہ مجھے بتاتے رہے کہ ماضی میں پاکستان' کشمیر' افغانستان اور وسطِ ایشیا کے کونسے کونسے علاقے' ایرانی سلطنت کا حصہ رہے ہیں--- ایرانیوں کی یہ سوچ علاقائی تعاون کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے--- میرا احساس یہ ہے کہ ایرانی' دعوے تو بہت کرتے ہیں' لیکن عمل کا وقت آتا ہے تو آگے نہیں بڑھتے--- ہم نے دفاعی میدان میں' پیش قدمی کی کوشش کی' لیکن ایک خاص حد پر جاکر وہ رک گئے۔

بشکریہ ہفت روزہ "زندگی" لاہور ۲۳ تا ۲۹ مئی ۱۹۹۲ء

ادارہ

تابعین کرامؒ کی باتیں

حضرت یونس بن عبید رحمہ اللہ

یونس نام۔ ابوعبید کنیت۔ بنی عبد قیس کے غلام تھے۔ حدیث میں اپنے عہد کے نہایت ممتاز حفاظ میں تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں۔ "کان ثقتہ کثیر الحدیث" صحابہ میں انہوں نے انس بن مالک کو دیکھا تھا۔ لیکن ان سے فیض یاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے زیادہ تر حضرت حسن بصری سے استفادہ کیا تھا حضرت یونس بن عبید کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ آپ کی دیانت اور ایمانداری کے بے شمار واقعات ہیں ایک مرتبہ ایک خاص مقام پر ریشم کا نرخ بہت چڑھ گیا تھا۔ انہیں معلوم ہوا۔ تو انہوں نے ایک دوسرے مقام کے ریشم فروش سے تیس ہزار کا ریشم خرید لیا۔ بعد میں ان کو خیال آیا۔ تو اس بیچنے والے سے پوچھا۔ تم کو فلاں مقام پر مال کے نرخ چڑھنے کی خبر تھی۔ اس نے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا۔ تو میں اپنا مال کیوں فروخت کرتا۔ یہ جواب سنا تو روپیہ لیکر مال واپس کر دیا۔

حضرت کعبؒ بن سور رحمہ اللہ

ایک ممتاز تابعی ہیں۔ حضرت عمر فاروق کے ہم صحبت و ہم جلیس تھے۔ نہایت ذہین اور طباع تھے۔ عہد فاروقی میں وہ بصرہ کے قاضی مقرر ہوئے اور عہد عثمانی میں بھی اسی عہدہ پر متمکن رہے۔ ان کے تقرر کا واقعہ یہ ہے کہ کعب ایک مرتبہ حضرت عمر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی۔ اور کہا کہ میں آپ کے پاس دنیا کے ایک بہترین آدمی کی شکایت لے کر آئی ہوں۔ کوئی آدمی عمل میں اس پر سبقت نہیں لے جا سکتا۔ اور اس کے جیسا عمل نہیں کر سکتا وہ قیام لیل میں صبح کر دیتا ہے۔ روزے میں سارا دن گذار دیتا ہے۔ اتنا کہنے کے بعد اس عورت کو شرم دامن گیر ہوئی اور اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کہ امیر المومنین مجھے معاف فرمائیے۔ آپ نے فرمایا خدا تم کو جزاء خیر دے۔ تم نے اچھی تعریف کی میں نے تم کو معاف کیا۔ اس کے بعد وہ عورت چلی گئی۔ اس کے واپس جانے کے بعد کعب نے حضرت عمر سے کہا کہ امیر المومنین! اس عورت نے آپ کے سامنے نہایت بلیغ پیرا یہ میں شکایت پیش کی ہے۔ فرمایا کیسی شکایت کعب نے کہا اپنے شوہر کی (یعنی وہ رات دن عبادت میں مشغول رہتا ہے اور اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا یہ سن کر حضرت عمر نے عورت کو بلوا کر کعب سے کہا تم دونوں کا فیصلہ کرو۔ کعب نے عرض کیا آپ کی موجودگی میں میں فیصلہ کروں؟ فرمایا جس چیز کو تم نے سمجھ لیا میں نہ سمجھ سکا۔ اس کا فیصلہ بھی تم ہی کو کرنا چاہئے کعب نے کلام پاک کی آیت سے استدلال پر کہ جب قرآن میں چار بیویوں کی اجازت ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے۔ کہ ہر چار شبانہ یوم میں ایک شبانہ یوم ہر بیوی کا حق ہوا۔ تو تنہا ایک بیوی کا کم سے کم یہی حق ہوگا۔ اس عورت کے شوہر کو تین دن روزہ رکھنے اور ایک دن بیوی کے لئے افطار کرنے اور تین رات عبادت کرنے اور ایک رات بیوی کے پاس رہنے کا حکم دیا۔

حضرت عمر یہ استدلال سن کر پھڑک اٹھے۔ اور فرمایا۔ کہ یہ (استدلال) میرے لئے پہلے (ذہانت) سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے۔ چنانچہ اس وقت ان کو بصرہ کا قاضی بنا کر بھیج دیا۔

(ماخوذ)

مولانا ابو ریحان سیالکوٹی　　　　قسط ۵

کشف سبائیت

اس لئے یہاں آپ کا سندیلوی صاحب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حوالہ دینا اگر بالفرض درست بھی ہوتا تو تب بھی اس سے آپ کی عبارت طرز استدلال اور نتیجۂ استدلال کی سبائیت نہ تو مبدل بسُنیت ہی ہو سکتی تھی اور نہ اسمیں کچھ تخفیف ہی آسکتی تھی حالانکہ اب تو آپ کا انکو اپنی صفائی میں پیش کرنا ہے ہی بالکل غلط اور بالکل بے محل جیسا کہ تفصیل ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ پر مظہری بہتان

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو اپنی صفائی میں قاضی صاحب کا پیش کرنا اس لئے غلط ہے کہ حضرت علیؓ نے کہیں بھی یہ استدلال حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا۔ قاضی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے خلاف اپنے اس استدلال کو خود حضرت علیؓ کا پیش کردہ استدلال جو کہا ہے تو یہ انکا حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بہتان ہے۔ میں قاضی صاحب کو حضرت علیؓ پر مظہری بہتان تراشی کا بہت بڑا الزام دے رہا ہوں انکو چاہیئے کہ وہ میدان میں اتریں اور اپنے آپ کو اس الزام سے بری ثابت کرنے کیلئے ہمیں بتائیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے موقف کی تائید میں خود یہ استدلال کب اور کہاں پیش کیا ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استدلال صرف اتنا ہی منقول ہے جتنا قاضی نے سندیلوی صاحب کی عبارت میں "البدایہ والنہایہ" کے حوالہ سے نقل کیا ہے یعنی "انما الناس مع المھاجرین والانصار الخ" اور "انما ہذا للبدریین دون غیرھم" اور بس رہا اس سے آگے آیت "والسابقون الاولون" الایۃ سے بھی اس موقع پر خود حضرت علیؓ کا استدلال کرنا؟ تو یہ ابھی تک قاضی صاحب کا صرف دعوی ہی دعوی ہے جسکا کوئی ثبوت انہوں نے پیش نہیں کیا۔ سندیلوی صاحب نے اس آیت کو حضرت علیؓ کی رائے کا اگر ماخذ قرار دیا ہے تو وہ انکا اپنا ایک خیال ہے خود حضرت علیؓ کا استدلال ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ حضرت علیؓ اس آیت سے خود استدلال کر ہی کیسے سکتے تھے جبکہ خود حضرت قاضی صاحب نے ہی یہ تصریح کر دی ہے کہ دورِ صحابہؓ میں صحابہؓ کے پیش نظر یہ نصوص نہ تھیں۔ اسوقت صحابہؓ نے اجتہاد کی بنا پر اپنا اپنا موقف اختیار کیا تھا (خارجی فتنہ ص ۵۳۴ ج ۱)

لہذا قاضی صاحب کا حضرت معاویہؓ کے خلاف اپنے اس استدلال کے بارے میں یہ کہنا کہ

"میں نے تو آیت والسابقون الاولون الایۃ سے وہی استدلال پیش کیا ہے جو حضرت علی المرتضیٰؓ نے اس آیت سے اپنے موقف کی تائید میں خود پیش فرمایا تھا"

یہ اگر حضرت علیؓ پر انکا بہتان نہیں ہے تو وہ اسکا ثبوت پیش کریں۔ ورنہ پھر بہتان تو بہرحال بہتان ہی ہے خواہ ابوریحان کا قاضی صاحب پر یا قاضی صاحب کا ہو حضرت علی المرتضیٰؓ پر ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ جتنا فرق قاضی صاحب اور حضرت علی المرتضیٰؓ میں ہے اتنا ہی فرق ابوریحان کے بہتان میں (جبکہ وہ ثابت ہوجائے) اور قاضی صاحب کے بہتان میں بھی ہوگا۔

جب تک قاضی صاحب اسکا کوئی ثبوت پیش نہیں کرتے کہ حضرت معاویہؓ کے خلاف انکا یہ استدلال خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہی پیش کردہ استدلال ہے اس وقت تک ان کے اس استدلال کو انکا اپنا استدلال ہی سمجھا جائیگا۔ جس کے ہر قسم کے نتیجہ کے ذمہ دار بھی وہ خود ہی قرار پائیں گے اور ان پر ہمارا اعتراض بھی اس وقت تک بحال رہے گا۔ دیکھیئے قاضی صاحب اس بارِ ثبوت سے کب عہدہ برآ ہوتے ہیں اور کب ہمارے اعتراض کا جواب دیتے ہیں؟

سندیلوی عبارت سے مظہری استناد کی حقیقت

باقی رہا قاضی صاحب کا اپنی صفائی میں سندیلوی صاحب کی عبارت کو پیش کرنا اور یہ کہنا کہ "میں نے تو -------- اس سلسلے مولانا سندیلوی کی ہی عبارت پیش کی تھی" (ص ۳۶) نیز یہ کہ حضرت علیؓ کے خود پیش کردہ استدلال کو "نقل کرنے والے بھی مولانا سندیلوی ہیں" (ص ۳۸) یہ بھی قاضی صاحب کو ہرگز ہرگز مفید نہیں کیونکہ حضرت علیؓ کے جس استدلال کو سندیلوی صاحب نے قاضی صاحب کے بقول نقل کیا ہے جب سرے سے وہ استدلال ہی حضرت علیؓ کا ثابت نہ ہوا تو اصولی طور پر سندیلوی صاحب کی وہ نقل اور عبارت ہی سرے سے بے بنیاد ہوئی اور ایسی بے بنیاد نقل و عبارت سے استناد اور وہ بھی ایک جلیل القدر مجتہد صحابیؓ کے خلاف؟ جتنا کچھ مفید اور مؤثر ہوسکتا ہے سب جانتے ہیں۔ لہذا اس اعتبار سے بھی حضرت معاویہؓ کے خلاف اس آیت سے قاضی صاحب کا استدلال خالص خود انکا اپنا ہی استدلال قرار پاتا ہے اور اس قسم کے نتیجے کے ذمہ دار بھی وہ خود ہی ٹھہرتے ہیں۔

قاضی صاحب چاہتے تو سندیلوی صاحب کی اس نقل و عبارت کو ہی غلط قرار دے سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے تو حضرت معاویہؓ کے اجتہادی موقف کو ہی بہرصورت غلط ٹھہرانا تھا اس کیلئے ایسی بے بنیاد نقل و عبارت کا سہارا بھی انکو کافی تھا لہذا انہوں نے اس بے بنیاد نقل و عبارت کو تو صحیح فرض کرلیا اور اسکی بنیاد پر حضرت معاویہؓ کے موقف کو بڑی تحدی کے ساتھ غلط قرار دیدیا۔ اسپر بھی غرہ انکو یہ ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی شرعی عظمت کا پورا پورا تحفظ کیا ہے۔

یہ تو گفتگو تھی قاضی صاحب کے لکھے ہوئے کے مطابق لیکن جہانتک امر واقعہ کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ آیت "اتباع باحسان" سے سندیلوی صاحب کے جس استدلال کو قاضی صاحب نے اسی آیت سے اپنے استدلال کی بنیاد بنایا ہے وہ استدلال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیش کردہ نہیں بلکہ سندیلوی صاحب کا ہی پیش کردہ ہے سندیلوی صاحب اس کے ناقل نہیں بلکہ خود ہی اس کے مستدل ہیں لیکن یہ بعینہ وہی استدلال ہرگز نہیں ہے جو اس آیت سے قاضی صاحب نے کیا ہے۔ قاضی صاحب کا اپنے استدلال کو وہی استدلال بتانا جو اس آیت سے سندیلوی

صاحب نے کیا ہے (جسکو قاضی صاحب غلطی سے حضرت علیؓ کا پیش کردہ استدلال کہہ رہے ہیں) بالکل غلط ہے ان سندیلوی و مظہری دونوں استدلالوں میں نسبت توافق کی ہرگز نہیں بلکہ تضاد کی ہے۔ کیونکہ

الف: سندیلوی استدلال، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادی موقف کیلئے تھا جبکہ مظہری استدلال، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اجتہادی موقف سے متعلق ہے۔

ب: سندیلوی استدلال، حضرت علیؓ کے موقف کی تائید و تصحیح کیلئے تھا جبکہ مظہری استدلال حضرت معاویہؓ کے موقف کی تردید و تغلیط کیلئے ہے۔

ج: سندیلوی استدلال، قاعدہ کے مطابق محض ظنی تھا چنانچہ انہوں نے اپنا استدلال شروع ہی ان الفاظ سے کیا تھا کہ "ان کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رائے کا ماخذ سورۃ التوبۃ پارہ ۱۱ کی مندرجہ ذیل آیت تھی" (ماہنامہ حق چاریار ص ۳۸) یہ سندیلوی صاحب اپنا خیال ظاہر کر رہے ہیں۔ اس آیت کو حضرت علیؓ کے مؤقف کی قطعی دلیل نہیں بنا رہے۔ جبکہ اس کے بالمقابل مظہری استدلال بالکل خلاف قاعدہ قطعی ہے۔ تبھی تو قاضی صاحب اپنے اس استدلال پر سندیلوی صاحب کو یہ چیلنج دیتے ہیں کہ "مسئلہ حالات کا نہیں مسئلہ نص قرآنی کے تقاضا کا ہے" قرآن کا جواب قرآن سے چاہیئے۔ اگر جواب نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے تو الخ"۔ (خارجی فتنہ ص ۷۷۴/ج ۱) اور ایسی چیلنج بازی، قطعی دلیل اور اس سے قطعی استدلال پر ہی ہوسکتی ہے۔

د: سندیلوی استدلال کا نتیجہ حضرت علیؓ کے مؤقف کا بالکل صحیح ہونا تھا چنانچہ سندیلوی صاحب نے اس آیت سے استدلال کر کے خود ہی اسکا نتیجہ یوں بیان کیا تھا کہ "شرعی زاویہ نظر سے انکا موقف بالکل صحیح تھا اسپر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں" (حق چاریار ص ۳۷) جبکہ مظہری استدلال کا نتیجہ حضرت معاویہؓ کے مؤقف کا بالکل غلط ہونا ہے چنانچہ قاضی صاحب نے اس آیت سے استدلال کر کے خود ہی اسکا نتیجہ یوں بیان کیا ہے کہ "تو اس صورت میں حضرت معاویہؓ کے مؤقف کو کون صحیح کہہ سکتا ہے" (خارجی فتنہ ص ۷۶۴/ج ۱)

یہ سب تو اس وقت ہے جبکہ سندیلوی استدلال کو مثبت لیا جائے۔ لیکن اگر اس کا منفی پہلو لیکر مظہری استدلال کی طرح اس کو بھی حضرت معاویہؓ کے خلاف ہی قرار دے لیا جائے تو تب بھی قاضی صاحب یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے اس آیت سے وہی استدلال پیش کیا ہے جو سندیلوی صاحب نے نقل کیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی ان دونوں استدلالوں میں کئی طرح سے فرق موجود ہے۔

الف: سندیلوی استدلال میں مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کو اس آیت کی رُو سے سب مسلمانوں کا متبوع و مقتدا کہا گیا تھا۔ بعد والوں پر ان کی پیروی لازم ہونے کی تعبیر اختیار نہ کی گئی تھی۔ جبکہ مظہری استدلال میں از روئے نص قرآنی ان کی پیروی لازم ہونے کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اور کسی کا متبوع و مقتدا ہونا اس سے کسی مسئلہ میں اختلاف کے منافی نہیں ہوتا۔ ایک آدمی اپنے کسی متبوع و مقتدا سے کسی مسئلہ میں اختلافِ رائے کر کے بھی بدستور اسکا تابع و مقتدی اور وہ دوسرا آدمی بدستور اسکا متبوع و مقتدا رہ سکتا ہے۔

قاضی صاحب کو ہی لیجئے! وہ، حضرت معاویہؓ، حضرات حکمین، حضرات عائشہ طلحہ، زبیر و دیگر اصحاب جمل و صفین (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو یقیناً اپنا متبوع و مقتدا ہی جانتے، مانتے اور کہتے ہوں گے لیکن اس کے باوجود ان کی جملی و صفینی رائے سے وہ اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ بخلاف کسی کی پیروی کے لازم ہونے کے کہ اس صورت میں اس سے کسی مسئلہ میں اختلاف کرنا اس کے منافی ہوتا ہے، ایک آدمی اپنے کسی ایسے آدمی سے جسکی پیروی اس پر لازم ٹھہرائی گئی ہو اختلاف رائے کر کے اسکا پیرو نہیں قرار پاسکتا۔

لہذا سندیلوی استدلال کا منفی پہلو لیکر اسکو حضرت معاویہؓ کے خلاف بھی اگر بنالیا جائے تو تب بھی انکی اس متبوعیت و مقتدائیت والی تعبیر میں ان کی طرف سے عذر پیش کئے جانے کی گنجائش بھی موجود ہے۔ یعنی ان کے صفینی موقف کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس نصوص قرآنی کے تقاضا کے خلاف نہ تھا۔ کیونکہ اس نص کا تقاضا سابقین مہاجرین و انصار کا متبوع و مقتدا ہونا ہے۔ سو حضرت معاویہؓ بھی انکو اپنے اختلاف کے باوجود اپنا متبوع و مقتدا ہی جانتے اور مانتے تھے، بخلاف مظہری استدلال اور اسکی تعبیر کے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے صفینی موقف کو اس نص قرآنی کے خلاف تو ٹھہرتا ہے لیکن اسمیں ان کی طرف سے کسی ایسی توجیہ یا عذر معذرت کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا ہے۔

ب: پھر سندیلوی استدلال میں متبوع و مقتدا ہونا بھی مطلقاً سابقین مہاجرین و انصار کا بیان کیا گیا تھا ان میں کے کسی خاص فرد کا متبوع و مقتدا ہونا بیان نہ کیا گیا تھا۔ اور مشاجرات میں چونکہ سب سابقین مہاجرین و انصار کا ایک ہی موقف نہ تھا بلکہ خود ان کے بھی مختلف مواقف تھے اس لئے ان میں سے کسی بھی موقف کی اتباع و اقتدا کرکے حضرت معاویہؓ کیلئے اپنے موقف میں نص قرآنی کی مخالفت کے الزام سے بچنے کا موقع سندیلوی استدلال میں موجود تھا۔ اس کیلئے سبھی سابقین مہاجرین و انصار کے سبھی مواقف کی اتباع و اقتدا ضروری نہ تھی۔ بخلاف مظہری استدلال کے کہ اس میں چونکہ مہاجرین اولین کے ایک خاص فرد یعنی حضرت علیؓ کی پیروی کو لازم بتایا گیا ہے اس لئے اسمیں خاص حضرت علیؓ کی پیروی نہ کرنے کی صورت میں نص قرآنی کی مخالفت کے الزام سے بچنے کا حضرت معاویہؓ کیلئے کوئی موقع نہیں ہے۔ بس یا پیروی یا نص قرآنی کی مخالفت کا الزام۔

ج: نیز سندیلوی استدلال میں سابقین مہاجرین و انصار کی اتباع کو رضاء الٰہی کا سبب کہا گیا تھا۔ اور قاعدہ ہے کہ ایک مسبَّب کے اگر کئی سبب ہوں تو کسی ایک سبب کے نہ پائے جانے سے اس مُسبَّب کا نہ پایا جانا لازم نہیں آیا کرتا۔ لہذا حضرت معاویہؓ اگر سابقین مہاجرین و انصار میں سے کسی فریق کی بھی اتباع و اقتدا بالفرض نہ کرتے تو تب بھی ان کا رضاء الٰہی سے محروم ہونا سندیلوی استدلال کی رُو سے لازم نہ آتا تھا اس لئے کہ صحابہؓ سے رضاء الٰہی کے اور بھی بہت سے اسباب موجود تھے، اس خاص سبب سے نہ سہی دوسرے اسباب سے وہ مُسبَّب کہی جاسکتی تھی۔ بخلاف مظہری استدلال کے کہ اس میں مہاجرین اولین و انصار کی اس اتباع کو رضاء الٰہی کی شرط قرار دیا گیا ہے اور اسکا قاعدہ یہ ہے کہ شرط کے فوت ہوجانے سے مشروط فوت ہوجایا کرتا ہے، لہذا حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ یا کسی بھی سابق مہاجر و انصار کی اتباع نہ پائی جانے کی صورت میں ان کیلئے رضاء الٰہی کے نہ پائے جانے کے سوا مظہری استدلال کا اور کوئی نتیجہ نہیں ہوسکتا۔

د: اسی طرح چوتھا فرق دونوں استدلالوں میں یہ بھی ہے کہ سندیلوی استدلال میں قیاس کا صرف ایک ہی مقدمہ مذکور تھا یعنی "سابقین مہاجرین و انصار کی اتباع کا سبب رضاء الٰہی ہونا" اسکا دوسرا مقدمہ یعنی "حضرت معاویہؓ کا ان کی اتباع نہ کرنا" اسمیں مذکور نہ تھا۔ لہذا اس دوسرے مقدمہ کی ذمہ داری سندیلوی صاحب پر نہ تھی بلکہ سندیلوی استدلال سے مظہری استدلال والا سبائی نتیجہ نکالنے کیلئے جو یہ مقدمہ اس میں جوڑنا وہی اس کا ذمہ دار بھی ٹھہرتا بخلاف مظہری استدلال کے اسمیں قیاس کے یہ دونوں مقدمے بالتصریح عبارۃ النص کے طور پر موجود تھے لہذا اس کے سبائی نتیجہ کے ذمہ دار بھی صرف اور صرف قاضی صاحب ہی تھے۔

الغرض آیت اتباع باحسان سے حضرت معاویہؓ کے خلاف قاضی صاحب کے استدلال کی کسی قسم کی ذرہ برابر بھی کوئی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ یا سندیلوی صاحب پر نہیں آتی بلکہ اس کے تمام تر ذمہ دار تن تنہا خود قاضی صاحب ہی اور نہ سندیلوی عبارت سے مظہری عبارت، طرز استدلال اور نتیجہ استدلال کی سبائیت میں کچھ تخفیف ہی آتی ہے حضرت علیؓ کا پیش کردہ تو یہ استدلال سرے سے ہے ہی نہیں قاضی صاحب کا اسکو حضرت علیؓ کا پیش کردہ استدلال کہنا

انپر مظہری بہتان ہے۔ اور سندیلوی صاحب نے جو اس آیت سے استدلال کیا ہے تو وہ مظہری استدلال سے مختلف ہے۔ اپنی اصلی یعنی مثبت حیثیت میں تو وہ حضرت علیؓ کے موقف کی تائید و تصحیح کیلئے ہے، حضرت معاویہ کے موقف کی تردید و تغلیط کیلئے نہیں جبکہ مظہری استدلال کا مقصد ہی حضرت معاویہؓ کے موقف کی تردید و تغلیط ہے۔ فشتان مابینہما۔ کہاں حضرت علیؓ کے موقف کی تائید و تصحیح اور کہاں حضرت معاویہؓ کے موقف کی تردید و تغلیط؟ اور اگر سندیلوی استدلال کو منفی بنا کر اس کو بھی حضرت معاویہؓ کے موقف سے ہی متعلق کرلیا جائے تو پھر بھی سندیلوی اور مظہری استدلال ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک تو اس لحاظ سے کہ سندیلوی استدلال کا نتیجہ حضرت معاویہؓ کا رضاء الٰہی سے مشرف نہ ہوسکنا اور ان کے موقف کا اس نص قرآنی کے خلاف ہونا، یقینی نہیں جبکہ مظہری استدلال کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور بنتا ہی نہیں۔ اور دوسرا اس اعتبار سے یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ سندیلوی استدلال کی تعبیر میں حضرت معاویہؓ کی طرف سے صفائی پیش کیجانے کی گنجائش بھی موجود ہے جبکہ مظہری استدلال کی تعبیر میں یا تو ایسی گنجائش ہے ہی نہیں یا اتنی نہیں۔

لہذا قاضی صاحب اپنے استدلال کی، طرز استدلال کی، غرض استدلال کی اور نتیجۂ استدلال کی بات کریں۔ سندیلوی صاحب کی عبارت کو چھوڑیں کہ وہ ان کے مطلب کی نہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تو اس سلسلے میں قاضی صاحب، نام بھی نہ لیں کہ ان کا دامن مظہری استدلال سے اس طرح پاک ہے جس طرح دم عثمانؓ سے۔

آیت میں اتباع سے کون سی اتباع مراد ہے؟

آخری مسئلہ اپنے تبصرے کی پہلی قسط میں قاضی صاحب نے یہ اٹھایا ہے کہ آیت "والذین اتبعوھم باحسان" میں مذکور اتباع سے یہاں کونسی اتباع مراد ہے؟

پس منظر اس کا یہ ہے قاضی صاحب نے سندلوی صاحب کی ضد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف آیت اتباع باحسان سے استدلال کرتے ہوئے ان کے بارے میں دو باتیں کہی تھیں ایک یہ کہ "ان سے اللہ کی رضا مشروط تھی، مہاجرین اولین و انصار کی اتباع باحسان کیساتھ" اور دوسری یہ کہ " یہ اتباع انہوں نے نہیں کی تھی بلکہ الٹا حضرت علیؓ جیسے مہاجر سابق اور موعود خلیفہ راشد کی قولی و فعلی مخالفت کی تھی" قاضی صاحب کی ان دونوں باتوں کا منطقی نتیجہ، حضرت معاویہؓ کا اللہ کی رضاء سے مشرف نہ ہوسکنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے مظہری استدلال کا یہ نتیجہ دکھلا کر پہلے تو یہ بتلایا تھا کہ مظہری استدلال کا یہ انداز اور اسکی یہ تعبیر اصول اجتہاد اور حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر مجتہد صحابی کی شان کے خلاف ہے۔ پھر میں نے یہ بتاتے ہوئے کہ حضرت معاویہؓ نے رضاء الٰہی کی یہ شرط بھی علی وجہ الاتم پوری کی تھی اور دیگر صحابہ کرام (علیہم الرضوان) کی طرح وہ بھی رضاء الٰہی سے بجا طور پر مشرف تھی ایک بات یہ لکھی تھی کہ

"آیت زیر بحث میں جس اتباع باحسان کا ذکر ہے اس سے تقریبا بالاتفاق اتباع ایمانی و احسانی مراد ہے نہ کہ اتباع اجتہادی اور یہ اتباع حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ سمیت تمام ہی السابقون الاولون کی کرکے رضاء الٰہی کی یہ شرط بھی چونکہ پوری کردی تھی اس لئے اس آیت کی رو سے بھی وہ رضاء الٰہی سے بجا طور پر مشرف ٹھہرتے ہیں" (ملخصاً)

لیکن قاضی صاحب کو یہ پسند نہ آیا کہ حضرت معاویہؓ، رضاء الٰہی کی یہ شرط پوری کرتے ہوئے نظر آئیں اس لئے انہوں نے میری اس بات کو رد کرنا اور حضرت معاویہؓ کو رضاء الٰہی کی یہ شرط پوری نہ کرتا ہوا ہی دکھانا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اسکا حاصل انہی کے الفاظ میں درج ذیل یہ تین باتیں ہیں۔

الف: مولانا ابوریحان کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ والذین اتبعوھم باحسان میں صرف ایمان کی اتباع مراد ہے۔ یہ صرف ایک قول ہے دوسری تفاسیر میں ایمان کے علاوہ دوسرے اقوال واعمال میں بھی اتباع مراد ہے۔

ب: میری بحث مولانا ابوریحان سے اس بات میں ہے کہ کیا حضرت علی المرتضیٰؓ نے بھی والذین اتبعوھم سے صرف ایمان میں اتباع مراد لی ہے یا دوسرے امور میں بھی۔ تو مولانا سندیلوی کی تشریح کے مطابق حضرت علی المرتضیٰؓ نے ایمان کے علاوہ دوسرے امور میں بھی اتباع مراد لی ہے۔

ج: قرآن کے چوتھے موعودہ خلیفہ راشد جو مہاجرین اولین میں سے ہیں، کیا ان کے ساتھ جنگ کرنا بھی خوبی کے ساتھ پیروی میں شامل ہے؟ (ص ۳۹، ۴۰)

قاضی صاحب، حضرت معاویہؓ کو رضاء الہی والی شرط پوری نہ کرنے والا بنانے پر ہی آخر کیوں بضد ہیں؟

قاضی صاحب کی مذکورہ باتوں کا جواب عرض کرنے سے پہلے یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ آیت اتباع باحسان، سندیلوی صاحب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کی تائید میں پیش کی تھی، میں نے اس کی تردید نہ کی تھی۔ حضرت علیؓ نے اس اتباع سے جو بھی اتباع مراد لی تھی میں نے اسکی تغلیط نہ کی تھی۔ موقف مرتضویؓ کی یہ سندیلوی دلیل میں نے نہ توڑی تھی۔ انکو بے دلیل میں نے نہ بتایا تھا۔ کیا تھا تو صرف یہ کہ قاضی صاحب نے اس آیت کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر پلٹتے ہوئے ان پر نص قرآنی کی مخالفت کا جو سیاسی الزام لگایا تھا میں نے اس سے ان کی براءت بیان کی تھی۔ انکو اس نص قرآنی پر بھی عمل کرتا ہی دکھایا تھا۔ اسی طرح قاضی صاحب نے انکو رضاء الہی والی شرط پوری نہ کرنے والا بتا کر رضاء الہی سے ان کے مشرف نہ ہوسکنے کا جو تاثر دیا تھا میں نے اس کا ازالہ کیا تھا۔ ان کو رضاء الہی والی یہ شرط پوری کرنے والا بتا کر دیگر صحابہؓ کی طرح انکا بھی رضاء الہی سے مشرف ہونا بیان کیا تھا۔

اور اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف نوران کے موقف کیلئے اس آیت سے کئے گئے سندیلوی استدلال پر قطعاً کچھ زد نہ پڑتی تھی۔ کیونکہ مدمقابل مجتہدین میں سے ایک مجتہد کے استدلال کا دوسرا مجتہد اگر کوئی جواب دیدے یا اپنے مذہب کے مطابق اسکی کوئی تاویل کردے تو اس سے مستدل مجتہد کا استدلال ختم یا مجروح نہیں ہوجایا کرتا۔ بلکہ مجیب مجتہد سے مخالفت نص کا الزام صرف دور ہوجایا کرتا ہے۔ مثلاً رفع یدین یا قراءۃ فاتحہ خلف الامام جیسے فقہی اختلافی مسائل میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اگر ادلۂ شافعیہ کا جواب دیتے یا اپنے مذہب کے مطابق انکی کوئی تاویل کرتے ہیں تو اس سے امام شافعی رحمہ اللہ کے دلائل اور ان سے ان کے استدلالات ہی ختم نہیں ہوجاتے اسی طرح بالعکس بھی۔ بلکہ مجیب مجتہد سے مخالفت نصوص کا الزام صرف دور ہوجاتا ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ آیت اتباع باحسان سے سندیلوی صاحب نے حضرت علیؓ کے موقف کی تائید میں استدلال کیا تھا۔ قاضی صاحب نے اصول اہل السنۃ اور قواعد اجتہاد کے بالکل خلاف اسکو حضرت معاویہؓ پر پلٹ کر ان پر اس نص قرآنی کی مخالفت کا الزام لگادیا اور انکو رضاء الہی والی یہ شرط پوری نہ کرنے والا بتا کر نتیجۃً انکو رضاء الہی سے محروم بنادیا تھا، میں نے ان کی طرف سے جوابدہی کرتے ہوئے نص قرآنی کی مخالفت والے اس مظہری الزام سے ان کی براءت بیان کی تھی انکو رضاء الہی والی یہ شرط بھی پوری کرنے والا بتا کر ان کو بھی رضاء الہی سے مشرف بنایا تھا اس سے نہ حضرت علیؓ کے موقف پر کوئی زد پڑتی تھی اور نہ انکا سندیلوی استدلال ہی ختم یا مجروح ہوا تھا۔

سوال یہ ہے کہ پھر بھی قاضی صاحب کو اس پر یوں رد و کد کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی؟ حضرت معاویہ کی یہ

براہ انکو آخر کیوں نہ بھائی؟ انکو ضرور بالضرور رضاء الٰہی والی یہ شرط پور نہ کرنے والا بنانے پر ہی آخر وہ کیوں بضد ہیں؟ انکو نص قرآنی کی مخالفت کرتا دکھانے پر ہی آخر وہ کیوں مصر ہیں؟ انکو اس نص قرآنی پر بھی عمل کرتا اور رضاء الٰہی کی یہ شرط بھی پوری کرتا دیکھنا آخر وہ کیوں برداشت نہیں کرسکتے؟

آخر کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے۔

اس کے بعد اب ملاحظہ ہو بالترتیب قاضی صاحب کی مذکورہ باتوں کا جواب۔

میں نے اس اتباع کا حصر نہیں کیا اتباع ایمانی میں

پہلی بات قاضی صاحب نے میرے بارے میں یہ کہی ہے کہ "میں نے آیت اتباع باحسان والی اتباع کا حصر کردیا ہے اتباع ایمانی میں جو کہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ صرف ایک قول ہے دوسری تفاسیر میں ایمان کے علاوہ دوسرے اقوال و اعمال میں بھی اتباع مراد ہے"

سو اس سلسلے میں پہلی گذارش یہ ہے کہ میں نے اس اتباع کا اتباع ایمانی میں حصر نہیں کیا بلکہ اتباع ایمانی کے بعد اتباع اجتہادی والا احتمال بھی دوسرے نمبر پر بیان کیا ہے۔ جسکی تفصیل میری کتاب کے دوسرے باب میں بیان ہوئی ہے جہاں میں نے اس اتباع کی مراد پر تفصیلی گفتگو کی ہے[1]

قاضی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر اس نص قرآنی کی مخالفت اور رضاء الٰہی والی یہ شرط پوری نہ کرنے والا جو الزام لگایا ہے میں نے اس سے حضرت معاویہؓ کی براءت بیان کرتے ہوئے یہاں نمبر وار پانچ باتیں عرض کی تھیں پہلی یہ کہ اس اتباع سے اتباع ایمانی مراد ہے نہ کہ اتباع اجتہادی۔ اور دوسری یہ کہ اگر اتباع اجتہادی بھی مراد لے لی جائے تو چونکہ حضرت معاویہؓ بھی مجتہد تھے اس لئے اتباع اجتہادی، مجتہدانہ مراد ہوگی نہ کہ محض مقلدانہ اس کے بعد تیسرے، چوتھے اور پانچویں نمبر پر میں نے حضرت معاویہؓ کے اس مظہری استدلال کا غیر تام، مضر اور نقصان دہ ہونا بیان کیا تھا۔

قاضی صاحب نے میری ان تمام باتوں کو تو چھوڑ دیا صرف اتباع کی مراد میں میرا بیان کردہ اتباع ایمانی والا صرف پہلا احتمال لیکر اسکو میری طرف سے اتباع ایمانی میں حصر کرنا بنادیا اور پھر اس کے غیر صحیح ہونیکا فتویٰ بھی لگادیا۔ حالانکہ میں نے اتباع ایمانی کے بعد اتباع اجتہادی والا احتمال بھی ذکر کیا تھا جس سے حصر کا شبہ تک بھی باقی نہ رہا تھا۔ لیکن قاضی صاحب نے یہاں میری دوسری باتوں کے ساتھ اس کو بھی یکسر نظر انداز کردیا۔ اگر وہ دوسری باتوں کو فی الحال نہ چھیڑنا چاہتے تھے تو نہ سہی لیکن جس بات کو چھیڑا تھا اسکو تو پوری کرلینا چاہیئے تھا۔ لیکن قاضی نے وہ بات بھی آدھی لی اور دوسری آدھی چھوڑ دی۔

مجھ سے ان کی عبارت صرف آگے پیچھے ہوگئی تھی تو وہ میری دیانت و امانت کو زیر بحث لے آئے تھے، لیکن

---

(1) واضح رہے کہ حضرت معاویہؓ کے خلاف اس مظہری استدلال پر ہم نے اپنی کتاب میں دو جگہ گفتگو کی ہے ایک یہاں پہلے باب میں اور دوسری مرتبہ دوسرے باب میں۔ یہاں اسپر گفتگو کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس مظہری استدلال کا طرز و تعبیر، اصول اہل السنۃ اور قواعد اجتہاد کے خلاف، مضر اور نقصان دہ ہے۔ اتباع کی مراد بیان کرنا یہاں مقصود اصلی نہیں وہ یہاں ضمناً بیان ہوئی ہے اسی لئے اسمیں یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اور دوسرے باب میں اصل گفتگو ہی چونکہ اتباع کی مراد پر ہے اس لئے وہاں ہم نے اس پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے لیکن یہاں بھی ہم صرف ایک اتباع ایمانی والا احتمال ہی ذکر نہیں کیا بلکہ اتباع اجتہادی والا دوسرا احتمال بھی ذکر کیا ہے۔ لہذا قاضی صاحب کا یہ کہنا کہ ہم نے اتباع کا اتباع ایمانی میں حصر کردیا ہے محض غلط ہے۔

یہاں دیکھیئے کہ میری عبارت کے ساتھ اپنی اس کتر بیونت کو وہ کیا نام دیتے ہیں؟

دوسری گذارش یہ ہے کہ میں نے تو یہاں اتباع ایمانی والی مراد کیساتھ اتباع اجتہادی والی مراد کا بھی ذکر کیا تھا، اس کے باوجود قاضی صاحب اسکو میرا اتباع ایمانی میں حصر کرنا بتلاتے ہیں لیکن خود انہوں نے حضرت معاویہؓ پر اس نص قرآنی کی مخالفت اور رضاء الٰہی کی یہ شرط پوری نہ کرنے کا الزام لگایا ہی صرف اور صرف اتباع انتخابی والے ایک احتمال پر ہے۔ اور اس کے ساتھ دوسرا کوئی احتمال انہوں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ قاضی صاحب کا اس اتباع کا اتباع انتخابی میں حصر کرنا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو میں نے تو اتباع ایمانی کے ساتھ یہاں اتباع اجتہادی والا ایک دوسرا احتمال بھی ذکر کیا تھا پھر وہ کیسے اتباع ایمانی میں حصر کرنا ہوگیا؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس اتباع کا اتباع انتخابی میں قاضی صاحب کا حصر کرنا صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے تو پھر میں نے اگر بالفرض اس اتباع کا اتباع ایمانی میں حصر کیا ہی تھا تو وہ کیسے غیر صحیح ہوگیا؟ اور اگر قاضی صاحب کا یہ حصر بھی غلط ہے تو جو غلط کام وہ خود مجھ سے پہلے کر چکے ہیں اسکا مجھ پر اعتراض کیسے کر رہے ہیں اور کیسے کر سکتے ہیں؟

تیسری گذارش یہ ہے کہ آیت زیر بحث والی اتباع کی مراد میں اتباع ایمانی والا احتمال تو قاضی صاحب بھی مانتے ہی ہیں لہذا جب تک پہلے وہ اس احتمال کو ختم نہیں کر دیتے اس وقت تک حضرت معاویہؓ کے خلاف، اتباع انتخابی کے احتمال پر اس آیت سے انکا استدلال "اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال" کے ضابطہ کے تحت باطل ہے۔ قاضی صاحب پہلے اتباع ایمانی و اجتہادی وغیرہ والے تمام احتمالات کو باطل کریں پھر اتباع انتخابی کے احتمال پر حضرت معاویہؓ کے خلاف اس آیت سے استدلال کریں۔ واذلیس فلیس۔ دیگر احتمالات کے ہوتے ہوئے اتباع انتخابی والے منجملہ ایک احتمال کی بنیاد پر حضرت معاویہؓ کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہاں اتباع انتخابی والے احتمال کے ہوتے ہوئے اتباع ایمانی وغیرہ والے کسی بھی احتمال کی بنیاد پر انکو نص قرآنی کی مخالفت وغیرہ کے اس مظہری الزام سے بری ضرور قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ الزام کیلئے تو یقینی دلیل درکار ہوا کرتی ہے جبکہ براءۃ از الزام کیلئے شک بھی کافی ہوجایا کرتا ہے۔ مجھے تو صرف ضابطے کی حد تک ہی یہ بات معلوم ہے اور قاضی صاحب کا تو ساری زندگی کا یہ عملی تجربہ بھی ہے۔

چوتھی گذارش یہ ہے کہ آیت زیر بحث والی اتباع کی مرادیں جب قاضی صاحب کے نزدیک بھی مختلف و متعدد ہوئیں تو صحابہ کرام (علیہم الرضوان) کے بارے میں ان میں سے وہی مراد لیجائیگی جو صحابہؓ کی شان کے مطابق ہوگی۔ وہ نہ لیجائیگی جو کسی صحابی کی شان کے خلاف ہو یا جس سے کسی صحابی پر کوئی الزام آتا ہو۔

بنا بریں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بالفرض اس آیت سے اگر خود بھی استدلال کیا اور اس اتباع سے انتخابی اتباع مراد لی ہے تو یہاں چونکہ یہی مناسب ہے اس لئے یہاں یہی اتباع مراد لیں گے۔ لیکن دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر چونکہ اس مراد سے الزام آتا ہے لہذا وہاں یہ مراد نہ لیں گے بلکہ ان کی طرف سے جوابدہی کرتے ہوئے وہاں اتباع ایمانی وغیرہ ہی مراد لیں گے۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف و استدلال بھی صحیح رہے گا اور دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اس نص قرآنی کی مخالفت وغیرہ کا الزام بھی عائد نہ ہوگا۔

اور تھے چونکہ دونوں ہی بزرگ مجتہد اور ہر مجتہد کو اپنے اجتہادی موقف سے متعلقہ نص کی استدلالی یا جوابی تاویل کا چونکہ حق حاصل ہوتا ہے لہذا یہاں بھی حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں ہی بزرگوں کو اپنے اپنے اجتہادی موقف کے پیش نظر اس اتباع کی مراد متعین کرنیکا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ ایک کی تاویل سے دوسرے کا حق تاویل ختم نہ ہوگا۔ اور ہر ایک کی تاویل اسی کے موقف کی بس تائید ہی کریگی، مدمقابل دوسرے مجتہد کے موقف کی تردید نہ کریگی۔ جیسا کہ اجتہادی دلائل کی شان ہوا کرتی ہے۔ جسپر قدرے تفصیلی گفتگو ہم اپنی کتاب "سبائی فتنہ" کی دوسری جلد میں کر چکے ہیں۔

یہاں بحث یہ نہیں کہ اس اتباع سے حضرت علیؓ نے کیا مراد لی ہے

بلکہ بحث یہ ہے کہ اس سے حضرت معاویہؓ نے کیا مراد لی ہے ؟

دوسری بات یہاں قاضی صاحب نے یہ کہی ہے کہ میری بحث مولانا ابوریحان سے اس بات میں ہے کہ کیا حضرت علی المرتضیٰ نے بھی والذین اتبعوھم میں صرف ایمان میں اتباع مراد لی ہے یا دوسرے امور میں بھی، تو مولانا سندیلوی کی تشریح کے مطابق حضرت علی المرتضیٰؓ نے ایمان کے علاوہ دوسرے امور میں بھی اتباع مراد لی ہے۔

قاضی صاحب کی اس بات کا جواب ملاحظہ کرنے سے پہلے قارئین یہ ذہن نشین کرلیں کہ یہاں زیر بحث آیت اتباع باحسان سے ایک استدلال ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صفینی اجتہادی موقف کی تائید و تصحیح کیلئے اور دوسرا استدلال ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے صفینی اجتہادی موقف کی تردید و تغلیط کیلئے۔ لیکن ان میں سے کوئی استدلال بھی بذات خود حضرت علیؓ نے نہیں کیا، نہ اپنے موقف کی تائید کیلئے اور نہ حضرت معاویہؓ کے موقف کی تردید کیلئے اور نہ انہوں نے اس اتباع سے یہاں کوئی اتباع ہی مراد لی ہے۔ بلکہ ان کے موقف کی تائید کیلئے تو استدلال کیا ہے سندیلوی صاحب نے اور انہوں نے ہی اس اتباع سے مراد بھی لی ہے جو بھی لی ہے۔ اور حضرت معاویہ کے موقف کی تردید کیلئے اس آیت سے استدلال کیا ہے قاضی صاحب نے۔ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے جوابدہی کرتے ہوئے جواباً اتباع سے مراد میں نے لی ہے جو بھی لی ہے، بذات خود حضرت معاویہؓ نے نہ اس تردیدی استدلال کا کوئی جواب دیا ہے اور نہ اس اتباع سے انہوں نے خود کوئی مراد لی ہے۔ لہذا اس آیت سے تائیدی یا تردیدی کسی بھی قسم کا استدلال کرنے اور اس اتباع سے مراد لینے کی تمام تر گفتگو سندیلوی صاحب، قاضی صاحب اور راقم الحروف ابوریحان کے درمیان دائر ہے۔ حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کا دامن ان تائیدی و تردیدی استدلالوں اور اتباع کی مرادوں سے بالکل پاک ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے یہاں اس استدلال کی اور اس اتباع سے مراد کی نسبت چونکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے اس لئے ہم بھی مشاکلتہً ان چیزوں کی نسبت حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کی طرف کر رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت وہی ہے جو ابھی بیان ہوئی۔ قارئین اس بات کو خوب اچھی طرح یاد رکھیں تاکہ کل کلاں قاضی صاحب اگر ہماری اس نسبت پر بہتان تراشی یا تضاد بیانی جیسا کوئی اعتراض اٹھائیں تو قارئین کو اسکی حقیقت جاننے کیلئے ہماری طرف سے جواب کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

سبائی فتنہ (جلد اول)

مصنف :- حضرت مولانا ابوریحان سیالکوٹی

ایک تہلکہ خیز کتاب ——— ایک علمی محاسبہ

ملنے کے پتے :- بخاری اکیڈمی دار بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان

شیخ فہیم اصغر فہیم چپل سٹور، قاضی مارکیٹ، تلہ گنگ

مفتی ابو معاویہ منظور احمد تونسوی

قسط ۴

آزر ـــــ کون ؟

چند شبہات کا ازالہ

۱۸ : تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں :۔

لکن قال محمد بن اسحاق والضحاك والکلبی ان آزر اسم ابی ابراھیم واسمه تارخ ایضا مثل اسرائیل ویعقوب وقال مقاتل وابن حبان آزر لقب لابی ابراھیم واسمه تارخ قال سلیمان التیمی ھو سب وعیب ومعناه فی کلامھم المعوج

لیکن محمد ابن اسحٰق اور ضحاک اور کلبی رحمہم اللہ نے فرمایا کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام ہے اور اس کا نام تارخ بھی ہے جیسے اسرائیل اور یعقوب دو نام ہیں ایک ذات کے، اور مقاتلؒ اور ابن حبانؒ نے فرمایا کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا لقب اور تارخ اس کا نام تھا، اور سلیمان التیمی نے فرمایا کہ آزر گالی اور عیب کو کہا جاتا ہے اور اس کا معنی ان کے کلام (لغت) میں ٹیڑھا ہونے کے ہیں۔

(تفسیر مظہری، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ ص۲۵۶ ج ۲)

اور ص۳۰۹ ج ۲ پر بخاری کی وہ روایت نقل کرتے ہیں جو امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے :۔ کہ قیامت کے دن ابراہیم علیہ السلام کے باپ آزر کی شکل مسخ کر کے اس کو دوزخ میں ڈالا جائے گا، اور اس کے بارے میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سفارش قبول نہیں کی جائیگی!

۱۹ : علامہ امام جلال الدین سیوطیؒ تفسیر اتقان فی علوم القرآن مطبوعہ دار الفکر بیروت کے ص۱۳۸ پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سلسلہ نسب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

(ابراھیم) قال الجوالیقی ھو اسم قدیم لیس بعربی و قد تکلمت بہ العرب علی وجوہ اشھرھا ابراھیم ..... وھو ابن ازر و اسمہ تارح بمثناۃ وراء مفتوحۃ و اخرہ حا مھملۃ" الخ۔

اسم شریف (ابراہیم) کا جو الجوالیقی نے فرمایا کہ یہ قدیم نام ہے جو کہ غیر عربی ہے اور اہلِ عرب نے اس کو کئی طریقوں سے پڑھا ہے سب سے زیادہ مشہور تلفظ ابراہیم ہے وہ آزر کا بیٹا ہے اور آزر کا نام تارح تھا۔ تا مثناۃ اور راء مفتوحہ اس کے آخر میں حا مہملہ ہے۔

۲۰: سیدنا لوط علیہ السلام کا نسب نامہ بیان کرتے ہوئے امام موصوف لکھتے ہیں:

(لوط) قال ابن اسحاق ھو لوط بن ھاران بن آزر و فی المستدرک عن ابن عباسؓ قال لوط ابن اخی ابراھیمؑ

ابن اسحٰق نے فرمایا کہ لوط ابن ہاران ابن آزر ہے اور مستدرک میں ابن عباسؓ سے روایت ہے فرمایا لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔

(اتقان فی علوم القرآن مطبوعہ دار الفکر بیروت ص ۱۳۹ ج ۲)

۲۱: تفسیر خازن میں ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ لِاَبِیْہِ اٰزَرَ اختلف العلماء فی لفظ آزر فقال محمد بن اسحٰق والکلبی والضحاک آزر اسم ابی ابراھیم وھو تارح ضبطہ بعضھم بالحاء المھملۃ و بعضھم بالخاء المعجمۃ فعلیٰ ھٰذا یکون لابی ابراھیم اسمان آزر و تارح مثل

"اور جب فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آزر کو"، علماء نے لفظ آزر میں اختلاف کیا ہے محمد بن اسحٰق اور کلبی اور ضحاک نے فرمایا کہ آزر نام ہے ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا اور وہی تارح ہے بعض نے اس لفظ کو حاء مہملہ سے ضبط کیا ہے اور بعض نے خاء معجمہ کے ساتھ تو اس بناء پر ابراہیم علیہ السلام کے والد کے دو نام ہوں گے آزر۔ اور تارح جیسا کہ یعقوب

يعقوب و اسرائيل اسمان لرجل واحد فيحتمل ان يكون اسمه الاصلي ازر وتارح لقب له و بالعكس و الله سماه ازر وان كان عند النسابين و المؤرخين اسمه تارح ليعرف بذلك وكان ازر ابو ابراهيم من كوفى وهى قرية من سواد الكوفة وقال سليمان التيمى ازر سب و عيب و معناه فى كلا مهم المعوج (الى) وقيل هو الخطئ فكان ابراهيم عابه وذمه بسبب كفره و زيغه عن الحق وقال سعيد بن المسيب و مجاهد ازر اسم صنم كان والد ابراهيم يعبد و انما سماه بهذا الاسم لان من عبد شيئاً او احبه جعل اسم ذالك المعبود او المحبوب اسما له فهو كقوله يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ وقيل معناه وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ

اور اسرائیل دو نام ہیں، ایک ہی آدمی کے تھے تو یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا اصلی نام آزر ہو اور تارح اس کا لقب ہو یا اس کے برعکس، بہر حال اللہ تعالیٰ نے تو اس کا نام آزر رکھا ہے اگرچہ علماء نسب اور مؤرخین کے ہاں اس کا نام تارح زیادہ معروف ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے والد کوفہ کے ایک دیہاتی گاؤں کے رہنے والے تھے بنا علیہ وہ کوفی کہلاتے ہیں، اور سلیمان تیمی نے کہا ہے کہ آزر کا معنیٰ خطاء، عیب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور ان کی زبان میں آزر کا معنیٰ کجرو (گمراہ) ہے یہاں تک کہ بعض نے کہا کہ آزر کا معنیٰ خطا کار ہے تو گویا ابراہیم علیہ السلام اس لفظ سے اس کو عیب لگا رہے ہیں اور اس کی مذمت کر رہے ہیں اس کے کفر اور حق سے روگردانی کی وجہ سے، اور سعید بن المسیبؒ اور مجاہدؒ نے فرمایا کہ آزر ایک بُت کا نام تھا ابراہیم علیہ السلام کے والد اس بت کی پرستش (عبادت) کرتے تھے اس وجہ سے اس کا نام اس کے معبود بُت کے نام پر رکھ دیا گیا ہے اور جاہلیت میں ایسا ہوتا رہتا ہے کہ محبوب کے نام پر محب کا اور معبود کے نام پر عابد

لِاَبِیۡہِ یا عابد آزر فحذف
المضاف واقیم المضاف
الیہ مقامہٗ والصحیح
ھو الاول ان آزر اسم
لابی ابراھیم لان اللّٰہ تعالیٰ
سماہ بہٖ وما نقل عن
النسابین والمؤرخین
ان اسمہ تارخ ففیہ نظر
لانھم انما نقلوہ عن
اصحاب الاخبار واھل
السیر من اھل الکتاب
ولاعبرۃ بنقلھم وقد اخرج
البخاری فی افرادہٖ من حدیث
ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللّٰہ
علیہ وسلم قال یلقی ابراھیم
علیہ السلام اباہ آزر یوم
القیامۃ وعلیٰ وجہ آزر
قترۃ وغبرۃ الحدیث فسماہ
النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
آزر ایضًا ولم یقل اباہ
تارخ فثبت بھذا ان اسمہ
الاصلی آزر لا تارخ واللّٰہ
اعلم۔ (تفسیر خازن ص۲۶، ۲۷ ج ۲)

کا نام رکھ دیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ
نے فرمایا ہے کہ جس دن ہم لوگوں کو ان
کے پیشواؤں کے نام پر بلائیں گے، اور
بعض نے کہا کہ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰھِیۡمُ
لِاَبِیۡہِ آزَرَ کا معنیٰ ہوگا اذ قال
ابراھیم لابیہ یا عابد آزر کہ
اے آزر کے پجاری، پھر مضاف کو
حذف کرکے مضاف الیہ کو اس کی جگہ
کھڑا کیا گیا ہے۔ اور صحیح پہلی بات ہے
کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا
نام ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان
کا یہی نام ذکر کیا ہے۔ اور وہ جو نسابین
اور مؤرخین سے منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام
کے باپ کا نام تارخ تھا، اس پر اعتراض
ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے یہ نام اہل
کتاب کے اہل اخبار اور اہلِ سیر سے
نقل کیا ہے اور ان کی نقل کا کوئی اعتبار
نہیں ہے۔ اور امام بخاریؒ نے افراد میں
حضرت ابی ہریرہؓ کی حدیث سے نقل کیا
ہے کہ نبیٔ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ قیامت کے روز ابراہیم علیہ السلام اپنے
باپ آزر سے ملیں گے اور آزر کے
چہرے (منہ) پر غبار اور سیاہی چھا رہی
ہوگی، الحدیث، پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر رکھا ہے نہ کہ تارخ ، واللہ اعلم !

۲۲ : تفسیر قرطبی میں ہے :

"وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ آزَرَ" تكلم العلماء فى هذا، فقال ابوبكر محمد بن محمد بن الحسن الجوينى الشافعى الاشعرى فى النكت من التفسير له: و ليس بين الناس اختلاف فى ان اسم والد ابراهيم تارخ والذى فى القرآن يدل على ان اسمه آزر، وقيل آزر عندهم ذمٌّ فى لغتهم كانه قال واذ قال لابيه يا مخطئ (أَتَتَّخِذُ اصنامًا آلهة) (الآية) قلت ما ادعاه من الاتفاق ليس عليه وفاق فقد قال محمد بن اسحاق والكلبى والضحاك ان آزر ابو ابراهيم عليه السلام وهو تارخ مثل اسرائيل ويعقوب (قلت) فيكون له اسمان كما تقدم وقال مقاتل آزر لقب وتارخ

"اور جب فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے" علماء نے اس بارے میں کلام کیا ہے ابوبکر محمد بن محمد بن الحسن الجوینی الشافعی الاشعریؒ نے النکت فی التفسیر میں فرمایا کہ اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ ہے اور وہ جو قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا نام آزر تھا اور کہا گیا ہے کہ آزر ان کی لغت میں گالی (ذم) کے لئے ہے گویا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا اے خطاکار! کیا تم بتوں کو الٰہ مانتے ہو"..... یہاں تک کہ محمد بن اسحاق اور کلبی اور ضحاک نے فرمایا کہ آزر جو ابراہیم علیہ السلام کے باپ ہیں وہ تارخ ہیں، یعنی ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے دو نام ہیں، ایک آزر اور دوسرا تارخ جیسے یعقوب اور اسرائیل ایک ہی ذات کے دو نام ہیں، اور مقاتل نے فرمایا! کہ آزر لقب اور تارخ نام ہے ثعلبی نے ابن اسحٰق القشیری سے اس طرح

اسم، وحکاہ الثعلبی عن ابن اسحاق القشیری ویجوز ان یکون علی العکس قال الحسن کان اسم ابیہ آزر ..... وقال الثعلبی فی کتاب العرائس ان اسم ابی ابراھیم الذی سماہ بہ ابوہ تارح فلما صار مع النمرود قیما علی خزانۃ الھتہ سماہ آزر وقال مجاھد ان آزر لیس باسم ابیہ وانما ھو اسم صنم وھو ابراھیم بن تارح بن ناخور بن ساروع ابن ارغوا بن فالغ بن عابر بن شالخ ابن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام الخ

(تفسیر القرطبی ص۲۲، ۲۳ ج ۷)

حکایت کی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آزر نام اور تارخ لقب ہو، حسنؒ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر تھا، اور ثعلبی نے کتاب العرائس میں فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ تارح بادشاہ وقت نمرود کے ساتھ معبودانِ باطلہ کے خزائن پر جب نگران ومنتظم مقرر ہوئے تو ان کا نام آزر پڑ گیا، اور حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ آزر دراصل بُت کا نام تھا جس کی پرستش تارح کیا کرتے تھے ورنہ ابراہیم علیہ السلام کا سلسلہ نسب یوں ہے، ابراہیم بن تارح بن ناخور بن ساروع بن ارغو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام الخ

۲۳: تفسیر حسینی میں ہے:

وقصۂ او آنست کہ گفت لابیہ آزر مر پدر خود آزر را کہ در کتب تواریخ نام او تارخ است وآزر لقب اوست

(تفسیر حسینی مطبوعہ مطبع رحمانی ص۱۴۹)

اور اس کا قصہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر کو فرمایا جس کے متعلق تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کا نام تارخ ہے اور آزر اس کا لقب ہے

۲۴: تفسیر بیان القرآن میں حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ لکھتے ہیں:

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر (نامی) سے فرمایا کہ کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو بے شک میں تجھ کو اور تیری ساری قوم کو صریح غلطی میں دیکھ رہا ہوں۔ (بیان القرآن صـ۲۸۵)

۲۵: حضرت اقدس شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ اپنے ترجمہ اور مختصر حواشی میں لکھتے ہیں:

قرآن مجید سے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر معلوم ہوتا ہے مگر توراۃ میں ان کا نام تارخ لکھا ہے اور علماء نسب و تاریخ کے نزدیک ان کا نام یہی ہے۔ مفسرین نے اس کے جواب میں کہا ہے شاید ان کے دو نام ہوں گے ایک آزر، دوسرا تارخ، یا ایک نام ہوگا اور دوسرا لقب، (ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ تاج کمپنی کراچی

۲۶: تفسیر حقانی کے مصنف علامہ ابو محمد عبدالحق حقانیؒ لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ ہے، آزر لقب ہوگا یا بالعکس اور یہ کہنا کہ آزر ان کے چچا تھے اور تارخ باپ، اس لئے کہ کسی نبی کا باپ مشرک نہیں گذرا ہے، محض تکلف ہے۔ (تفسیر حقانی مطبوعہ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند صـ۴۳ ج ۲)

۲۷: شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا لکھتے ہیں:

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر کو تو کیا مانتا ہے بتوں کو خدا۔ الخ صـ۱۷۶

۲۸: تفسیر عثمانی میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں۔

علماء انساب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ لکھا ہے ممکن ہے تارخ نام اور آزر لقب ہو، ابن کثیرؒ نے مجاہد وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ آزر بت کا نام تھا شاید اس بت کی خدمت میں زیادہ رہنے سے خود ان کا لقب آزر پڑ گیا ہو۔

(تفسیر عثمانی مطبوعہ مدینہ پریس بجنور انڈیا صـ۱۷۶)

۲۹: تفسیر ماجدی میں آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے علامہ عبدالماجد صاحب دریا آبادی لکھتے ہیں:

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو بے شک میں تو تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھتا ہوں۔ تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حاشیے پہلے گذر چکے ہیں، آپ ایک بت پرست، اور ستارہ پرست قوم کے درمیان اپنے آبائی ملک بابل یا کلدان (موجودہ عراق)

میں بحیثیت مبلّغ توحید دعوتِ اسلام و توحید سب سے پہلے اپنے خاندان ہی کے رکن اعظم یعنی اپنے والد کے سامنے پیش کرتے ہیں، آزر عربی توریت میں اس نام کا املاء تارح ملتا ہے اور انگریزی میں تیرا اور تالمود میں ترا۔ جو لوگ علم اللسان کے مبادی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی نام مختلف زبانوں میں جاجاکر کیسے کیسے عجیب تلفظ اختیار کرلیتا ہے۔ فلسطین کے قدیم مسیحی مؤرخ یوسیبیس ۲۶۴ء تا ۳۴۹ء کے ہاں "آثر" یا "ہاتھر" آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کی مشابہت ومماثلت آزر سے بالکل ظاہر ہے اور آزر و تارہ بھی اگر ایک ہی مادہ سے مشتق ہوں تو کچھ بعید نہیں۔ ایک گمراہ فرقہ اپنے مخصوص عقائد کے تحفظ و پشت پناہی کی خاطر شروع سے کہتا آرہا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے والد کا نہیں بلکہ چچا کا نام تھا، اور حال کے ایک آدھ جدید گمراہ فرقے بھی یہی کہ رہے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی تحقیق کے نام کی کوئی چیز نہیں۔ رہے محض "احتمالات وامکانات" یہ تو ہر قطعی سے قطعی مستند میں بھی پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ اب کو اس کے بالکل کھلے ہوئے ظاہر معنیٰ سے ہٹاکر مجازی استعمال کی طرف لے جانے کے لئے آخر کوئی معقول وجہ بھی تو ہو۔ الخ۔ (تفسیر ماجدی مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی ص ۲۹۷)

۳۰: تفسیر کشف الرحمٰن میں سحبان الہند حضرت علامہ احمد سعید صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تو بتوں کو معبود مانتا ہے اور ان اصنام کو معبود ٹھیراتا ہے یقیناً میں تجھ کو اور تیری تمام قوم کو جو اس باطل عقیدے کی پیروی ہے صریح گمراہی میں دیکھتا ہوں۔ (کشف الرحمٰن مطبوعہ رشیدیہ کراچی ص ۲۱۷ ج ۱)

۳۱: تفسیر تفہیم القرآن میں سید مودودی صاحب لکھتے ہیں:

ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا تو بتوں کو خدا بناتا ہے میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔ (تفہیم القرآن مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور ص ۵۵۳ ج ۱)

۳۲: کنزالایمان میں مولانا احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں:

اور یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو خدا بناتے ہو بیشک میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں ۔ (کنز الایمان مطبوعہ ادارہ الفلاح کراچی ص۱۶۳)

۳۳ : البرہان فی تفسیر القرآن میں سید ہاشم الحسینی البحرانی رافضی نے بھی لکھا ہے کہ

عن العیاشی عن ابی بصیر قال سئلت ابا عبد اللّٰہ علیہ السلام عن قول اللّٰہ " اِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ لِاَبِیْهِ آزَرَ " قال کان اسم ابیہ آزر الخ (البرہان فی تفسیر القرآن مطبوعہ قم ایران ص۵۴۲ ج ۱)

عیاشی ابو بصیر سے نقل کرتے ہیں ابو بصیر نے کہا کہ میں نے ابو عبد اللہ جعفر صادق سے اِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ لِاَبِیْهِ آزَرَ الخ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر تھا۔

۳۴ : ملا محسن فیض کاشانی اپنی تفسیر صافی میں لکھتا ہے ۔

والعیاشی علیہ السلام انہ سئل عن قولہ تعالیٰ " وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ لِاَبِیْهِ آزَرَ " قال کان اسم ابیہ آزر والعلم عند اللّٰہ ۔

عیاشی نے امام جعفر صادقؓ سے پوچھا کہ ارشاد ربانی وَاِذْ قَالَ الخ کا کیا مطلب ہے انہوں نے کہا کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تھا۔ (تفسیر صافی ص۱۶۷ ج ۱ سورۃ الانعام)

۳۵ : عن ابی بصیر قال سئلت ابا عبد اللّٰہ عن قول اللّٰہ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ لِاَبِیْهِ آزَرَ ، قال کان اسم ابیہ آزر الخ

ابی بصیر سے روایت ہے کہ انہوں نے ابا عبد اللہ جعفر صادقؓ سے قول باری تعالیٰ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ لِاَبِیْهِ آزَرَ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تھا۔

(تفسیر عیاشی ص۳۶۲ ج ۱ ، مصنفہ ابی النضر محمد بن مسعود ابن عیاش السلمی قندی المعروف بالعیاشی)

ساغر اقبالی

زبان میری ہے بات اُن کی

-- اہل وطن کو نیا ہجری سال مبارک! (ادارہ روزنامہ "جنگ" یکم محرم)
خیر مبارک!

-- بے نظیر اجلاس میں شرکت کے لئے آئیں گی تو استعفے ان کے پرس میں ہوں گے۔ (غفاری)
استعفے ہیں یا میک اپ کا سامان؟

-- جامع مسجد صدیق اکبر چنیوٹ میں قرآن پاک کے ۴۰ نسخے نذر آتش! (ایک خبر)
شورش ایسی پود پر اژدر برسنے چاہئیں
آگ میں تپتے ہوئے پتھر برسنے چاہئیں

-- تھانے نیلام ہو رہے ہیں۔ ایس ایچ او سے اوپر تک سب رشوت لیتے ہیں (قاضی حسین احمد)
پتہ نہیں سرکاری پتھاریداروں سے عوام کی جان کب چھوٹے گی!

-- میں جنت میں نہیں جاؤنگی (اسلام آباد کے گیسٹ ہاؤس میں خودکشی کرنے والی اقوام متحدہ کی خاتون افسر)
نہ تو جنت کے قابل تھی نہ جنت تیرے قابل ہے۔

-- پاکستان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ ۲۰ ہزار کا مقروض ہے۔ (مولانا عبدالستار خان نیازی)
اسی لئے آپ نے شادی نہیں کی نا---؟

-- بیٹوں نے باپ کو سر بازار برہنہ کر کے چھتروں سے پٹائی کی (ایک خبر)
ان ناسعید بیٹوں کی قسمت الٹ گئی

-- یونان کے مذہبی لیڈروں نے مائیکل جیکسن کو شیطان کا چیلا قرار دے دیا (ایک خبر)
شیخ رشید! کچھ سنا آپ نے!

-- میں اپنے بچوں کے ہمیشہ اپنی مرضی سے نمبر لگواتا ہوں (ایک استاد)
جانے کس مٹی کے ذرے ہیں تمہاری خاک میں
بدتر از سرطان ہو اس سرزمین پاک میں

-- مسلم دنیا کی بدقسمتی ہے کہ دوسرا بھٹو پیدا نہیں ہوا۔ (پروفیسر اے ایچ درانی)
خصوصاً پاکستان کی، جو کسی دوسرے بھٹو کے ہاتھ سے ابھی تک محفوظ ہے۔

-- امریکہ-- ۸۱ سالہ دلہا-- ۵۱ سالہ دلہن--- دلہا کی ۲۸ ویں دلہن کی ۲۲ ویں شادی (ایک خبر)
لعنت بر پدر فرنگ!

--پشاور میں مشتعل مظاہرین نے تین سینما گھروں کو آگ لگادی (ایک خبر)

صنعت سامری جلاڈالی

--فرانس-۷۱ سالہ شخص نے اپنی پوتی سے شادی کرلی (ایک خبر)

فرانس سے آنے والے پاکستان میں بھی یہی کچھ چاہتے ہیں۔

--عابدہ حسین اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مشورہ دینے کے بعد اب کشمیر کاز کو نقصان پہنچانے کے در پے ہیں (مولانا غلام محمود) ● سبائی اور رافضی تیرہ سو برس سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے چلے آئے ہیں۔

--اسلامی شریعت کورٹ کی نہیں۔ پارلیمنٹ کی بالادستی چاہتے ہیں (بے نظیر)

کس منہ سے فاطمۃ الزہرؓ کو اپنا آئیڈیل کہتی ہو؟

--پیپلز پارٹی کے لیڈر ملک مختار اعوان فاحشہ عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے موقع پر گرفتار (ایک خبر)

اس قبیلے کا ہر پیرو جواں گستاخ ہے۔

--پی ڈی اے کی قیادت حکومتی مظالم کے خلاف مردانہ کردار کا مظاہرہ کرے۔ (طاہر القادری)

زنانہ قیادت سے مردانہ کردار کے مظاہرے کا مطالبہ "درمیانہ قیادت" ہی کرسکتی ہے۔

(بقیہ از صفحہ)

لپیٹ دی گئی ہے۔ اگر کوئی اکا دکا اللہ کا بندہ اپنے اسلاف کی امانت سنبھالے بیٹھا ہے تو اب اس سے آگے لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ کارخانۂ عالم کا نظام تا قیام قیامت چلے گا۔ اس نظام کا چلانے والا ہی اپنے سب کاموں کی حکمت جانتا ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالےٰ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی حسنات قبول فرمائے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے اور آپ کے نقشِ قدم پر ہم سب کو چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آنچہ از ما گمشدہ گر از سلیماں گم شدے

ہم سلیماں، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

بقیہ از صفحہ ۲۲

شاہ جی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ لہٰذا مستقبل کی اولادِ آدم بھی ان سے اس روحانی استفادہ کو یقیناً جاری رکھے گی۔

رہِ وفا میں ترے بعد آنے والوں کو

قدم قدم پہ ملیں گے نشان منزل کے

بقیہ صفحہ ۳5

• معمار اور غیرت ملی و حمیت کا پاس دار خیال کرتے تھے۔ ان کی ذہنی و دلی خواہش تھی کہ علی گڑھ اپنے کردار کے لحاظ سے عظمت ملی کا گہوارہ اور اسلام کی شان کا ایک ایسا مجلا آئینہ ثابت ہو جس کی آب و تاب کو حالات و انقلاب کی کوئی آندھی بھی دھندلا نہ سکے۔

✿

مولانا محمد سعید الرحمن علوی

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر
(ایک دھماکہ خیز کتاب)

اس وقت جو سطور ہم تحریر کرنے بیٹھے ہیں اور جو "نقیب ختم نبوت" کے ذریعہ آپ کے سامنے آئیں گی۔ وہ واقعہ کربلا کے حوالہ سے ہماری کوئی طبع زاد یا تحقیقی تحریر نہیں بلکہ ایک کتاب کے تعارف کے حوالہ سے ہے جو حال ہی میں منصہ شہود پر آئی اور طبع ہوتے ہی اس نے ایک کہرام بپا کردیا

کتاب ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کے اس شہر سے شائع ہوئی جسے لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شیعہ اسکول کے اہم مرکز ہونے کے حوالہ سے اس شہر کی ایک تاریخ ہے پھر دیوبند اور علی گڑھ کی علمی تحریکوں کے بعد تیسری بڑی تحریک "ندوۃ العلماء" کے حوالہ سے بھی اس شہر کی ایک تاریخ ہے۔ اس شہر کا ایک تعارف "فرنگی محل" کا علمی خاندان و ادارہ بھی ہے جس کا اس ملت پر بڑا احسان ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں لکھنؤ ایک مستقل روایت کا حامل ہے، اہل لکھنؤ کی نزاکت کے بھی بڑے چرچے ہیں۔ ایک زمانہ میں اسی شہر سے ایک تحریک اٹھی جس کا مقصد کائنات کے سب سے سچے انسان، نبوت و عصمت کے خاتم، سرکار دو عالم و عالمیان محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وسلامہ کی تربیت یافتہ جماعت کے ذکر خیر پر پابندی لگوانا تھا۔ اس تحریک کو اٹھانے والے وہ رافضی تھے جن کا ضمیر مدینہ و یمن کے یہودیوں اور ایران کے مادر پدر آزاد مجوسیوں کے گٹھ جوڑ سے اٹھا تھا۔ اسی تحریک کا ردعمل وہ تحریک تھی جو مجاہدین و کارکنان احرار نے اٹھائی اور مؤرخ نے غیرت مندوں کی اس تحریک کو "مدح صحابہ" کی تحریک کا نام دیا اور محمد عربی ﷺ کے سچے رب نے اپنے محبوب بندے کی تربیت یافتہ جماعت کے معاملہ میں اپنی عزت کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ رفض و سبائیت اور اس کے ملعون فرنگی سرپرست کی ساری تدبیریں الٹ گئیں۔

ماضی قریب میں اس شہر کی آبرو حضرت الامام مولانا عبد الشکور فاروقی نقشبندی مجددی تھے۔ جنہیں آج خدام صحابہؓ و ازواجؓ و بنات رسولؐ، "امام اہلسنت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہی مولانا لکھنوی جنہوں نے اپنے اخبار "النجم" کے ذریعہ رفض و سبائیت کے رسوائے زمانہ اور مکروفریب کے مرکزی قلعہ پر ایسی بمباری کی کہ رفض و سبائیت کے علمبردار بلبلا اٹھے اور اگر میں یوں کہوں کہ آج اس شہر کی آبرو مولانا محمد منظور نعمانی اور ان کے فرزندانِ عزیز مولانا عتیق الرحمن اور محب گرامی مولانا خلیل الرحمن ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

سنبھل ضلع مراد آباد کا یہ خاندان ایک عرصہ سے لکھنؤ میں مقیم ہے جبکہ اس سے قبل اس خاندان کو مولانا احمد رضا خان کے شہر بریلی میں قیام کا موقعہ ملا۔ مولانا محمد منظور نے بڑی صفائی سے زیر تبصرہ و تعارف کتاب کے ابتدائیہ میں اپنے

آبائی قصبہ "سنبھل" کے حالات لکھوائے ہیں کہ وہاں کے سنی کس طرح محرم کے ایام میں رفض کا جامہ پہن لیتے حتی کہ خود ان کے اپنے گھر میں علم کی کمی اور حقائق سے نا آشنائی کے سبب بہت کچھ ہوتا۔ لیکن قدرت اس خاندان پر یوں مہربان ہوئی کہ مولانا محمد منظور کو مرکز علم وہدایت دیوبند میں تعلیم کا موقعہ مل گیا۔ اس وقت دیوبند کے افق پر علم و معرفت کے بڑے بڑے ستارے چمک رہے تھے۔ لیکن جس شخصیت کو نیر تاباں کی حیثیت حاصل تھی اس کا نام نامی سید محمد انور شاہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ وہی سید انور شاہ جن کے متعلق السید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا تھا کہ "کشمیر کے ہمہ نوع حسن کو قدرت نے حسن مجسم کا رنگ دے کر انور شاہ بنادیا اور اب کشمیر میں کچھ نہیں" خوش قسمت مولانا نعمانی نے اس عظیم شخصیت سے کسب فیض کیا۔ پھر تدریس و تعلیم کی راہ اختیار کی حتی کہ وہ بریلی میں پہنچ گئے اور "الفرقان" کے نام سے ایک رسالہ کا اجراء کیا (جس کی ساٹھویں جلد کا ساتواں شمارہ جولائی ۹۲ء میں سامنے آیا ہے) کچھ عرصہ بعد آپ اس رسالہ سمیت لکھنؤ آگئے۔ گویا یہ رسالہ اپنی زندگی کی ساٹھ بہار پوری کررہا ہے اور میں نے اپنی شعوری زندگی میں بہت سے نامور اہل علم کو یہ کہتے سنا کہ انہیں اپنی عملی زندگی میں اس رسالہ سے بہت فائدہ ہوا۔ جنوبی ایشیا کے اردو رسائل میں اتنی عمر کا شاید ایک آدھ اور رسالہ ہو، اور یہ بات طے ہے کہ اس رسالہ کا مخصوص علمی مزاج اور اس کی ثقاہت ہر زمانہ میں مسلم رہی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ علمی انداز ہونے کے باوجود اسکی زبان ہمیشہ شستہ اور سادہ رہی یعنی بھاری بھرکم علمی اصطلاحات سے بچ کر ایک مخصوص معیار اپنایا گیا تاکہ اہل علم سے عامۃ الناس تک سبھی اس سے برابر استفادہ کرسکیں۔

مولانا نعمانی مختصر وقت کے لئے مولانا مودودی کی تحریک وجماعت سے بھی وابستہ رہے اور اس وابستگی کا مقصد محض اور محض دین اسلام کی خدمت تھی لیکن بانی تحریک کے حقائق درون خانہ سے واقف ہونے کے بعد مخلص و متدین مولانا نے فوراً اس تحریک سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنی "داستان وصل و فصل" کو اس خوبی سے مرتب کردیا کہ جماعت اسلامی کے حلقے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ اس کتاب کی ایک ایک سطر سے للّٰہیت و خلوص ٹپکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ مولانا ہی تھے جنہوں نے مولانا احمد رضا خان کی "تحریک تکفیر" کے سامنے بند باندھا اور مولانا احمد رضا خان نے حضرت اللام مجاہد فی سبیل اللہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید سے لے کر مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی، مولانا خلیل احمد اور مولانا تھانوی تک جیسے بندگانِ اخلاص کے خلاف جو تکفیری مہم چلائی اس کا مؤثر انداز سے علمی توڑ کیا اس زمانہ میں ایک بہادر، صاحب علم اور سنجیدہ مزاج مناظر کے طور پر ان کی شہرت جنوبی ایشیا کے چپہ چپہ میں پھیلی ہوئی تھی حتی کہ لاہور کا وہ معروف معرکہ جس کے منصف و ثالث علامہ اقبال، خواجہ صادق حسن اور مولانا فیروز الدین روحی تھے، اس معرکہ میں بھی اہل صدق و صفا کے وکیل مولانا نعمانی ہی تھے۔

ان کے رسالہ نے نصف صدی سے زیادہ کے سفر میں بعض یادگار نمبر شائع کئے اس عشق و محبت کے سفر میں زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مؤلف (مولانا کے بڑے لڑکے) کبھی دست و بازو رہے تو آج کل دوسرے فرزند خلیل میاں دست و بازو ہیں۔

مولانا ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے گویا اب ان کی عمر ۸۷ برس ہے۔ عمر کے حوالہ سے کئی عوارض انہیں لاحق ہیں لیکن ہمیشہ کی طرح قدرت اب بھی ان پر مہربان ہے اور اپنے معروف سلسلہ "معارف الحدیث" کو وہ مسلسل آگے بڑھا رہے ہیں تو دوسرے اہم موضوعات پر بھی ان کی تحریریں سامنے آتی رہتی ہیں۔ جس کا معنی یہ ہے کہ فضل الٰہی سے ان کے دل و

دماغ سلامت ہیں، علم مستحضر ہے اور اساتذہ و اکابر سے حاصل کردہ سرمایہ کو اللہ کی مخلوق میں لٹانے اور اس روشنی سے ظلمت کدہ دہر کو منور کرنے میں وہ اب بھی مصروف ہیں۔ (متع اللہ المسلمین بابقائھم و نفع اللہ المسلمین بعلومھم و معارفھم)

مولانا کی زندگی کے اس دور کا عظیم کارنامہ ان کی وہ معرکتہ الاراء کتاب ہے جو "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" کے نام سے چند سال قبل ایسے وقت میں سامنے آئی جب ایران میں خمینی کے ذریعہ برپا ہونے والے انقلاب کا چار سو شہرہ تھا۔ قرآن و حدیث کی حقیقی تعلیم سے بے بہرہ اور دین اسلام اور پیغمبر و اصحاب پیغمبر کی غیرت سے عاری بندگانِ ہوس اسے "اسلامی انقلاب" کا نام دے رہے تھے ہر طرف حیرت و استعجاب اور خوف و دہشت کی فضا طاری تھی اور اس انقلاب کو دوسرے ممالک میں ایکسپورٹ کرنے کے منصوبے بن رہے تھے ایسے ماحول میں اللہ تعالی کے جو با توفیق بندے سامنے آئے اور اس انقلاب اور اس کے بانی اور اس کے انداز فکر کی قلعی کھولی اور حقائق کو بے نقاب کیا انہیں مولانا سر فہرست تھے۔ ان کی کتاب پاکستان و ہندوستان میں بلاشبہ لاکھوں کی تعداد میں چھپی اور پڑھی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی عربی، فارسی اور انگریزی وغیرہ متعدد زبانوں میں اس کے تراجم چھپے اور بڑی تعداد میں دنیا میں پھیلے------- بلامبالغہ یہ کتاب اس دور کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ثابت ہوئی اور اس کے ذریعہ جہاں یورپ و امریکہ حقائق سے آشنا ہوئے وہاں اہلسنت برادری کی بڑی تعداد کے سامنے اصلیت بے نقاب ہوئی، پھر مولانا نے ہی دوسرا کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ حقائق کی بنیاد پر ایک استفتا مرتب کر کے پاک و ہند کے ذمہ دار علمی و دینی اداروں اور اہل علم کے پاس بھیج کر جواب حاصل کیا اور یوں رفض و سبائیت کی گمراہ کن تحریک کے اسلام کے متوازی اور مدمقابل کافرانہ تحریک ہونے پر "اجماع امت" کا سامان فراہم کیا، اور اب یہ کتاب سامنے آئی جو ہر چند کہ ان کے خلف الرشید اور صاحب علم و فضل فرزند مولانا عتیق الرحمن حال مقیم لندن کے قلم سے ہے۔ لیکن بہر حال اس کے اجر و ثواب میں مولانا نعمانی برابر کے شریک ہیں کہ انہی کی تحریک اس کا باعث بنی۔

احقر کو چند ماہ قبل اس کتاب سے آگاہی ہوئی اور اس کا باعث جمعیت علماء اسلام کے ایک رہنما تھے جو اپنے "تبلیغی دورہ لندن" سے واپس تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے اس طرح بتلایا گویا یہ میرا کوئی خاص مسئلہ ہے اور ان کا یا ان کے قافلہ کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں اصل حسرت یہی ہے کہ آج برادران اہلسنت اور علی الخصوص ان کے مذہبی و علمی اور روحانی مقتداء رفض و سبائیت کے معاملہ میں مرعوبیت کا شکار ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں اس خالص یہودی و مجوسی تحریک کے جراثیم گھسے ہوئے ہیں اور وہ صدر اسلام سے اسلام کی مدمقابل اس گمراہ کن ملحدانہ اور کافرانہ تحریک کو محض ایک فرقہ وارانہ مسئلہ قرار دے کر اپنی نام نہاد سیاسی ضرورتوں کے لئے اس کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو دی جانی چاہیئے۔

آج کے سنی اہل علم و دانش تمام مصدقہ شیعی لٹریچر سامنے آجانے کے باوصف اندھے اور بہرے پن کا شکار ہیں اور یہ حضرات اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے تو یہ "شجرۂ زقوم" اب تک اپنی جڑوں سے کٹ چکا ہوتا۔

بہر حال جب میرے علم میں کتاب آئی تو میں نے ہندوستان میں اپنے محسن، برادر بزرگ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کو لکھا۔ جنہوں نے کتاب کا نسخہ کسی صاحب کے ہاتھ بھجوایا جو لاہور آرہے تھے لیکن معلوم نہیں وہ نسخہ مجھ تک کیوں نہ پہنچا؟ کیا وہ کسٹم کے عملہ کے ہتھے چڑھ گیا یا ان صاحب کا رابطہ لاہور میں کسی ایسے سنی نما رافضی سے ہو گیا جو اس کتاب کی اشاعت اور مطالعہ میں رکاوٹ ہے؟ واللہ تعالی اعلم

خیر اللہ بھلا کرے عزیز سید کفیل شاہ سلمہ کا کہ انہوں نے مجھے کتاب ارسال کی اور اس خواہش کے ساتھ کہ میں اس

پر تعارف و تبصرہ کے حوالہ سے لکھوں۔ جو نقیب ختم نبوت میں شائع ہوسکے۔

میں نے ۲۵۶ صفحات کی اس کتاب کو اپنے باقی تمام معمولات پورے کرکے بھی دو دن میں پڑھ لیا۔ اب جو لکھنے کے لئے میرے دل میں تلاطم پیدا ہوا تو ابتدا اور انتہا سے بے نیاز لکھنے بیٹھ گیا۔

اس موڑ پر اس بات کا اظہار کرنا از بس لازم ہے کہ پاکستان کے اور خاص طور پر لاہور کے بعض ایسے بزرگ جن کے لاہور کی مذہبی کتابوں کی مارکیٹ پر گہرے اثرات ہیں، برابر اس کوشش میں ہیں کہ یہ کتاب یہاں نہ چھپے لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح حق کو چھپایا جانا ممکن ہے؟ ہمارے عزیز کفیل میاں سلمہ بہرحال اس کو چھاپنے کا تہیہ کرچکے ہیں اور کیا عجب کہ اس تحریر کے ساتھ ہی کتاب آپ کے سامنے آجائے۔ اور ہاں جناب یہ بھی سن لیں کہ اس کتاب کے خلاف جو سب سے پہلا مخالفانہ ردعمل سامنے آیا وہ لکھنؤ کی اس درسگاہ کا ہے جسے ایک دنیا "ندوۃ العلماء" کے نام سے جانتی ہے جس کے قیام کے لئے صدی بھر قبل کے بندگان اختصاص نے اللہ تعالیٰ کے حضور دامن پھیلا کر اس کے قیام کی سعی کی اور آج اس کے نظم و انتظام کی مکمل ذمہ داری اس بزرگ عالم کے سر ہے جن کا اسم گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہے بعض اعتبارات سے ان کا ہمارے دل میں بڑا احترام ہے لیکن صدر اسلام کے مخصوص حالات و واقعات اور موجودہ عالمی تناظر میں ان کے سیاسی خیالات سے ہم اپنے آپ کو کبھی متفق نہ کرسکے۔

ان کی کتاب "المرتضیٰ" سیدنا الامام خلیفہ رابع و راشد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح حیات ہے وہ سامنے آئی تو ہمیں مولانا سراج الحق مچھلی شہری رحمہ اللہ تعالیٰ یاد آگئے جنھوں نے مولانا مودودی کی رسوائے زمانہ کتاب "خلافت و ملوکیت" پر تبصرہ لکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ہر سند میں کسی نہ کسی درجہ میں رفض کے جراثیم ضرور ہوتے ہیں" مولانا کی کتاب "المرتضیٰ" پر ہم پہلے بھی بعض تحریروں میں گفتگو کرچکے ہیں اور یہ عرض کرچکے ہیں کہ مولانا کی نگاہ محبت نے غازی اورنگ زیب کو تو چھٹا خلیفہ راشد مان لیا لیکن خاندانی عصبیت نے سیدنا الامام خلیفہ راشد و سادس معاویہ بن ابی سفیان الاموی القرشی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حضور ان کی عقیدت کی گردن نہ جھکنے دی---------- فیا حسرتا۔

مولانا منظور نعمانی کی کتاب "ایرانی انقلاب" پر مولانا ابوالحسن کے ابتدائیہ نے ہم جیسے بہت سے سادہ لوحوں کو ان کے معاملہ میں کسی قدر خوش فہمی میں مبتلا کردیا تھا کہ شاید وہ سادات کے مخصوص عوامل سے بلند ہوچکے ہیں لیکن آہ ثم آہ کے ان کے زیر اہتمام چلنے والے ادارہ کے ترجمان "تعمیر حیات" میں ان کے شاگرد رشید اور ندوہ کے ناظم تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس نے جو لکھا اور مولانا نے پھر جس طرح بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا اس سے ہمارا رشتہ احترام مجروح ہوگیا اور اسے ہونا ہی چاہیئے تھا کہ پندرہویں صدی کے بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں صدر اسلام کی مقدس شخصیات کی عزت و حرمت بہرحال عزیز ہے اور ہم صبح قیامت صحابہ کرامؓ کے جوتوں میں اپنے لئے بالشت بھر جگہ کی تو ربّ محمد ﷺ سے درخواست کرسکتے ہیں اور ہمیشہ کرتے ہیں لیکن باقی کسی کے لئے ایسے جذبات ممکن ہی نہیں خاص طور پر وہ حضرات جو ہمارے سامنے ہیں اور ہم بقائمی ہوش و حواس ان کے حالات دیکھ رہے ہیں، ان کے لئے ایسی خواہش کون کرے؟---------- ہاں ان کے اور اپنے لئے اور ہر سنی کہلانے والے کیلئے یہ دعا ضرور ہے اور بار بار کہ

"اے رب محمد ﷺ۔ قیامت کی صبح اپنے پاک محبوب نبی آخر اور معصوم آخر کے فیض یافتہ، تربیت یافتہ لوگوں کی رفاقت و صحبت، جی نہیں، ان کے جوتوں کی جگہ نصیب فرمادینا ہمیں یقین ہے کہ ان پاکبازان امت کی جوتیوں کی جگہ نصیب ہوجائے تو ربیع مسکون کی دولت سے وہ افضل و اعلیٰ ہے---------- اللھم آمین

بجاہ نبی الانبیاءؑ، امام الرسل خاتم المعصومین والنبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم!

ندوہ کے بے توفیق مبصر نے جو لکھا اس پر اضطراب کے عالم میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک غیرت مند نوجوان نے مجھے براہ راست لکھا جبکہ اسی اثنا میں الفرقان کی اشاعت خاص مئی، جون ۱۹۹۲ء اور اشاعت جولائی ۹۲ء مجھے پہنچ گئی ان دونوں اشاعتوں کو پڑھنے کے بعد میں نیم بسمل ہو گیا اور سوچنے لگا کہ بار الٰہ، تیری زمین پر کیا ہو رہا ہے، جو بندے تیرے رسول ﷺ، تیرے دین اور تیرے قرآن کے نام پر عزتیں اور دولت حاصل کر رہے ہیں وہ بھی اتنے بے دید و بے لحاظ ہو چکے ہیں کہ اصحاب محمد ﷺ کے ایک بڑے حصہ کے معاملہ میں ایسے سوقیانہ اور گمراہ کن خیالات کے حامل ہیں اور کربلا کے جعلی، مصنوعی اور افسانوی حصہ پر گفتگو کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ

"بنو امیہ نے نواسۂ رسول ﷺ کو شہید کر کے بدر میں اپنے مقتول بزرگوں کا بدلہ چکایا"

بنو امیہ جیسے عظیم قبیلہ سے وابستہ صحابہ و تابعین کے خلاف کوئی جلا سڑا رافضی یہ تبصرہ نہ کرسکے جو ندوہ کے ناظم تعلیمات نے کیا---------- اور پھر ندوہ کے عالی مرتبت مہتمم نے ندوہ کے ترجمان رسالہ میں چھپنے والی اس الحاد آمیز، گمراہ کن اور رفض کی بھرپور وکالت کرنے والی تحریر کا سدھا سادا نوٹس لینے کے بجائے روایتی "کتاب الحیل" کے سہارے معاملات کو پس منظر میں دھکیلنے کی کوشش کی؟

تاہم اللہ بھلا کرے ہندوستان کے ان اصحاب علم و دانش کا جنہوں نے نہ صرف اس کتاب کا شاندار الفاظ میں خیر مقدم کیا بلکہ ارباب ندوہ کے اس طرز عمل کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ سب حضرات اس قابل ہیں کہ مل جائیں تو ان کے قلم چوم لئے جائیں اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے لیا جائے۔ ان سب حضرات کو فرداً فرداً مخاطب کر کے وہی بات کہوں گا جو امیر شریعت مخصوص مواقع پر فرماتے

تیری آواز مکے اور مدینے

اس ضمن میں جو نام سامنے آئے وہ آپ بھی دیکھ لیں------ ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ---------- مولانا عبد القدوس رومی مفتی و خطیب آگرہ (مصنف کتب کثیرہ)------- مولانا مفتی منظور احمد مظاہری قاضی کان پور و رکن مجلس شوریٰ مدرسہ دیوبند--------- چودھری علی مبارک عثمانی بارہ بنکی،------- مولانا مجیب اللہ ندوی بانی و ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ------ مولانا عبد العلی فاروقی نبیرہ امام اہلسنت مولانا عبد الشکور لکھنوی------- مولانا محمد عیسیٰ لندن---------- مولانا محمد عبد اللہ بھمبر آزاد کشمیر---------- مولانا جمیل احمد نذیری مبارک پور---------- سید خالد محمود بہرائچ ریڈر شعبہ باٹنی تربھون یونیورسٹی نیپال------- اور مولانا تسخیر الحسن ندوی بارہ بنکی۔

ان سب حضرات کے تبصرے، تحریریں انتہائی درجہ وقیع ہیں اور ان میں سے ہر تحریر کی ایک ایک سطر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، ان میں سے بعض حضرات جدید مدارس و جامعات کے ذمہ دار لوگ ہیں تو بعض قدیم مدارس و مساجد کے حوالہ سے انتہائی ذمہ دارانہ مناصب پر فائز--------- ان کی تحریروں کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اس سے یہ حقیقت الم نشرح ہوتی ہے کہ سچائی کے طالب دنیا میں بڑی مقدار میں موجود ہیں اور جب کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ صدق و راستی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سامنے آتا ہے تو وہ آواز رائیگاں نہیں جاتی۔

اس کتاب کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۳۷۳ھ میں "الفرقان" کے بعض قارئین کی خواہش پر مولانا محمد منظور کے حکم

سے ان کے فرزند مولانا عتیق نے ایک مضمون لکھا جس میں امکان بھر صحیح روایات سے سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ شہادت کو سپرد قلم کیا---------- یہ مضمون ذوالحجہ ۷۳ھ میں چھپا---- اس میں سیدنا حسین سلام اللہ تعالیٰ علیہ ورضوانہ کی سہ گانہ شرائط میں سے امیر یزید کے پاس جا کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے (بیعت کرلینے) کی شرط پر طوفان اٹھا کہ یہ بات عقیدت میں غلو کے مارے روایت پرستوں کے لئے ایک ایٹم بم کی حیثیت رکھتی تھی---------- خود مولانا نعمانی جو اس وقت سفر میں تھے واپس آئے تو برہم ہوئے لیکن مولانا عتیق اس معاملہ کو اور بھی سبرھن کر چکے تھے اس لئے انہوں نے یہ دوسری مدلل تحریر ابا جان کے سامنے رکھی تو مولانا مطمئن ہوگئے اور یہ تحریر محرم ۷۴ھ میں شائع ہوگئی جس سے طوفان رک گیا اور گز بھر لمبی زبان والوں کی زبانیں بند ہوگئیں۔

چند سال قبل مولانا نعمانی کی کتاب "ایرانی انقلاب" سامنے آئی تو پرانے متعلقین نے مولانا عتیق کے تیس سال قبل کے ہر دو مضمون دوبارہ کتابی شکل میں چھاپنے کی فرمائش کی۔ مولانا نعمانی نے سعادت مند بیٹے سے فرمایا کہ دونوں مضامین نکال کر انہیں نظر ثانی کے بعد "کتب خانہ الفرقان" کے سپرد کردو لیکن جب عتیق میاں نے انہیں نکالا تو ابا حضور سے عرض کیا کہ اب تو اس موضوع پر بہت کچھ کھنگالنے اور از سر نو لکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا نعمانی نے اس تجویز کو پسند کیا اور لکھنؤ کے بعد لندن کے کتب خانوں کی مہینوں خاک چھان کر اور ان گنت راتیں آنکھوں میں کاٹ کر مولانا عتیق نے یہ کتاب لکھی------ لطف یہ ہے کہ انہیں سب سے زیادہ بنیادی مواد ندوہ کے کتب خانہ سے ملا، انہوں نے ندوہ کے کتب خانہ کے ناظم کا انتہائی محبت سے شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے کتابوں کے حصول و فراہمی میں بڑا مخلصانہ تعاون کیا---------- جس کا معنیٰ یہ ہے کہ کتب خانوں میں بہت کچھ موجود ہے لیکن پڑھنے کی فرصت کم ہے، اگر فرصت ہوتی تو ندوہ کے ذمہ دار اس طرح برہم نہ ہوتے اور بنوامیہ کے بزرگ صحابہ و تابعین کی دشمنی میں اس حد تک نہ جاتے۔

مزید لطف یہ ہے کہ لندن کے امامیہ سنٹر کی لائبریری سے انہیں بہت کچھ ملا اور اس لائبریری کے شعبہ نگران کی خواہش پر مولانا عتیق نے شعبہ اسکول کی بعض کتابیں بطور خاص حاصل کر کے مطالعہ کیں۔

اس تمام کاوش کے نتیجہ میں جو سامنے آیا اس کو انہوں نے اس عنوان سے مرتب کیا

"واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر---------- ایک نئے مطالعے کی روشنی میں"

الفرقان بک ڈپو لکھنؤ سے چھپنے والی اس کتاب کا انتساب عتیق میاں نے اپنے والد بزرگوار کے نام کیا تو ابتدائیہ مولانا نعمانی کا املا کرایا ہوا ہے جو ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ابتدائیہ میں انہوں نے اپنے آبائی قصبہ اور خاص اپنے گھریلو حالات۔ اپنی تعلیم اور اس کتاب کی شان تصنیف و تالیف پر ضروری روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب ہے جو ایک مقدمہ اور ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے---------- اپنے اپنے ذوق کی بات ہے، ہمارے نزدیک ۲۴ صفحات کا مقدمہ حاصل کتاب ہے اور اتنا جامع اور وقیع، کہ اسکو الگ سے چھپوا کر بڑی تعداد میں تقسیم کرنا آج کے ذمہ داران اہلسنت کی اہم ذمہ داری ہے اس مقدمہ میں ان سبھی بنیادی باتوں پر سیر حاصل بحث ہے، جو باتیں اس واقعہ کو دیومالائی بنانے کا باعث بنی ہیں۔ تاریخی روایتوں کا جو حال ہے، اس پر طبری کے اعتراف اور بعض مثالوں کے توسط سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کربلا کے واقعہ کے متعلق غلط بیانی کے اسباب کا تذکرہ ہے، سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات کی تفصیل ہے۔ نبی علیہ السلام کی قرابت کے احترام اور شیعی عقیدہ عصمت پر گفتگو ہے۔ لکیر کے فقیروں کو طلب علم و تحقیق پر ابھارا گیا ہے اور مومن کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد پہلے باب میں سیدنا عثمان بن عفان الاموی القرشی رضی اللہ تعالی عنہ کی شہادت، خانہ جنگی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بسیدنا معاویہ سے صلح اور حضرت الامام معاویہ کی طرف سے حضرات حسنین کریمین سے حسن سلوک و محبت اور احترام باہمی کی تفصیلات آپ کو ملیں گی۔

دوسرے باب میں حضرت حسین کو اپنے یہاں دعوت دے کر بلانے والے اھل کوفہ کے مزاج اور ان کی ریشہ دوانیوں پر تفصیلی بحث ہے اور بتلایا گیا ہے کہ صدر اسلام کے ان تمام واقعات کے اصلاً ذمہ دار اسی شہر کے لوگ تھے جنھوں نے سیدنا علی سے سیدنا حسین تک کو پہلے اپنے یہاں بلایا پھر شہید کردیا۔

تیسرا باب امیر یزید کی ولی عہدی کی بحث پر مشتمل ہے اور اس باب میں بطور خاص سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالی جیسے جلیل المرتبت صحابی پر سید مودودی سے لے کر بہت سے عاقبت نااندیشوں نے جو لن ترانیاں ہانکیں ان کا شافی جواب دے کر فاضل مؤلف نے اصحابؓ رسول ﷺ کے اعلیٰ مقام و احترام کو جس طرح واضح کیا وہ ان کا امت پر عظیم احسان ہے اس کے بعد چوتھا، پانچواں اور چھٹا باب بھی ولی عہدی کی بحث سے متعلق ہے، اس اقدام کے محرک کون تھے؟ اس کی حکمت کیا تھی؟ اس راہ میں رکاوٹ کون تھے اور کس لئے، اور آپ کو ان ابواب سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ ولی عہدی فی ذاتہ نہ جرم ہے نہ حرام، اور جبکہ اسکا مقصد امت کا مفاد اور اس کی بہتری ہو اور جسے ولی عہد بنایا جارہا ہو وہ اہل بھی ہو تو پھر اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔

ساتویں باب میں سیدنا معاویہ کی وفات اور امیر یزید کی حکومت و عہد کی ابتدائی داستان ہے، اس دوران ولی عہدی کے معاملہ میں اختلاف کرنے والے حضرات میں سے کس نے کیا رویہ اختیار کیا اور بالخصوص حضرت حسین امیر مدینہ سے ایک خاص حوالہ سے گفتگو کر کے کس طرح خاموشی سے مکہ معظمہ چلے گئے، اس کی تفصیلات آپ کے سامنے آئیں گی۔

آٹھویں باب میں آپ کے مکہ معظمہ میں ورود، اہل کوفہ کے خطوط، اور ان کے وفود آنے کا تذکرہ ہے پھر آپ نے اپنے چچا زاد حضرت مسلم کو جس طرح کوفہ بھیجا اور ابتداء میں پذیرائی کے بعد وہ جس طرح بے چارگی سے شہید ہوئے اور انہوں نے ابتدا میں حضرت حسین کو کوفہ بلانے اور پھر شہادت سے قبل روکنے کے لئے جو پیغام بھیجے وہ سب آپ کے سامنے آئیں گے اور اس پس منظر میں حسین و خاندان حسینؓ کے قاتلین کے چہرے بے نقاب ہوتے نظر آئیں گے۔

نویں باب میں قافلہ حسین کی روانگی کی المناک کہانی ہے۔ کون کون سے مخلص انہیں کس کس طرح روکتے ہیں، حکومتی اہلکار کس طرح خوشامد کرتے ہیں اور وہ ہر ایک کو نظر انداز کر کے کس طرح سفر جاری رکھتے ہیں پھر راستہ میں حضرت مسلم کی شہادت کا سن کر واپسی کا عزم اور پھر سہ گانہ شرائط---- (جن کا ذکر گذرا)--------- وہ سب آپ کو ملے گا اور یہ بھی کہ انہوں نے حالات کو بھانپ کر کوفہ کے بجائے دمشق کا رخ کرلیا تاکہ امیر یزید سے معاملات طے کرسکیں بلکہ بیعت کرسکیں یہ سب اس باب کے ابحاث ہیں۔

دسواں باب کربلا کی سرگزشت پر مشتمل ہے۔ اس جگہ کا جغرافیہ۔ وہاں کی آب و ہوا۔ پانی کی بندش وغیرہ کے افسانے، سیدنا حسین سے منسوب تقریریں۔ ان کا تجزیہ۔ حکومتی اہلکاروں کا رویہ۔ معرکہ کی کیفیت۔ مبارزانہ جنگ کی داستان سرائی اور ایسے ہی ابحاث ہیں جنہیں آپ پڑھیں گے تو شیعہ ذاکروں سے لے کر میڈیا کے جاہل دانشوروں اور نام نہاد سنی واعظین و مبلغین میں سے ہر ایک آپ کو کذاب و بدلگام نظر آئے گا۔ اور آپ سوچیں گے کہ حقائق کیا ہیں اور آپ کو آج تک کیا بتلایا اور سنایا گیا۔

گیارہویں باب میں شہادت کے بعد کی کہانی ہے۔------ پچھلے متعدد ابواب کی طرح یہاں بھی سیدنا حسین کے نبیرہ اور اس سفر میں شریک بزرگ حضرت محمد الباقر کی روایات کے ذریعہ سچائی کا اظہار ہے جبکہ جھوٹے راویوں کا پوسٹ

مارٹم۔ اور یزید کے گھر میں ہونے والے حسن و سلوک کی مفصل کہانی۔

رہ گیا آخری باب تو فاضل مؤلف نے اس کا سرنامہ قرآن کی ایک آیت کے ٹکڑے کو بنایا جس کا مفہوم ہے

"اللہ تعالیٰ کا ایک حکم تھا اور تقدیر کا فیصلہ جو پورا ہو کر رہا"

گویا۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک نوشتہ تقدیر تھا جو پورا ہوا۔۔۔۔۔۔۔ سوال یہ ہے کہ اس کا راز کیا تھا اور حکمت کیا؟ اس پر فاضل مؤلف نے عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی پھر بعض قابل احترام اہل علم بالخصوص حضرت الشیخ ابن تیمیہ کے حوالہ سے سیدنا حسین کے اقدام پر گفتگو کی ہے ساتھ ہی حکمرانوں کے خلاف خروج کے مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس کی حدود کا تعین کرنے کی سعی کی ہے۔۔۔۔۔۔۔ وہ "ظلم کی ذمہ داری کس پر؟" کا عنوان قائم کر کے یزید و ابن زیاد کی حیثیت کا تعین کرنے کی سنجیدہ کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی بتلاتے ہیں کہ امیر یزید نے ابن زیاد کو سزا نہیں دی تو کیوں۔۔۔۔۔۔۔؟ اغلباً اس کے سامنے ایسی ہی مجبوریاں تھی جیسی سیدنا عثمان کے قصاص کے معاملہ میں سیدنا علی کے سامنے۔۔۔۔۔۔۔ کہ آخر تاریخ اپنے آپکو ایک مرتبہ نہیں بار بار دہراتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ بھی بحث سامنے آتی ہے کہ جب حضرت حسین اپنی شرائط میں امیر یزید کے پاس جا کر بیعت تک کرنے کا عندیہ ظاہر کرتے ہیں تو اس کے باوجود ابن زیاد اس پر کیوں مصر ہے کہ نیابتاً پہلے میری بیعت کی جائے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ بہرحال اس بات کو ابن زیاد کی بے توفیقی ہی قرار دیتے ہیں کہ اس نے امیر یزید کے پاس حضرت حسین کے تشریف لے جانے کی شرط کو جو اُن کی انتہائی جذباتی قربانی تھی، قبول نہ کر کے اور ایک طرح کی ضد کر کے

"ایک ایسے واقعہ کی ذمہ داری سر لے لی جس نے ایک بار پھر خونیں فتنوں کا دروازہ ہی نہ کھولا بلکہ اعتقادی فتنوں کی رگوں میں نیا خون بھی دوڑا دیا"

اور ظاہر ہے کہ یہ بڑا ہی نقصان ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بہرحال سیدنا حسین کی شہادت کے ایک تاریخی واقعہ کو مولانا رشید احمد گنگوہی کے بقول یاروں نے عقیدہ کا مسئلہ بنا کر جو اودھم مچا رکھا ہے اور ہر سال محرم آتے ہی جو حالت ہوجاتی ہے اور جس طرح پورے ماحول پر سوگ کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور حکمرانوں سے علماء تک اور صوفیا سے عوام تک کی اکثریت جس طرح رافضی یا نیم رافضی کا روپ دھار لیتی ہے، اس زہر کے تریاق کے لئے انشاء اللہ تعالیٰ یہ کتاب کافی و شافی ہوگی۔۔۔۔۔۔۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ صحابہ کرام کے پاکباز گروہ کے ایک ایک فرد کے اس مقام کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے جس کا ملحوظ رکھنا قرآن پاک اور ارشادات رسالت مآب کی روشنی میں لازم و ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی تاریخی روایتوں کے تضادات، مورخین کی بوالعجبیوں، اور افسانوی حکایتوں کا ایسا پوسٹ مارٹم ہے کہ دودھ اور پانی ہر ایک نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

مولانا عتیق نے اس نازک موضوع کو چھیڑ کر اس دنیا میں ہی "پل صراط" پر چلنے کا خطرہ مول لیا لیکن ہم، اللہ علیم و خبیر کو گواہ بنا کر عرض کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ راستہ کامیابی سے طے کیا۔ ہر ایک جس احترام کا مستحق تھا وہ اسے پوری طرح دے کر صدق و راستی کا چہرہ روشن کیا وہ چہرہ جس پر صدیوں سے یہود و مجوس کے زلہ رباؤں نے گرد کی تہیں جمادی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ رب العزت انہیں اس نیکی کا بڑا اجر دے اور جو لوگ فتنہ مجوس و یہود کا شکار ہیں، رب العزت انہیں ہدایت سے سرفراز فرمائے اور ہم سب کا اخروی انجام صحابہ علیہم الرضوان کے غلاموں میں ہو۔ ہماری خواہش ہے کہ اخلاقی تقاضے پورے کر کے اس کتاب کو پاکستان میں بکثرت شائع کر کے اس طرح پھیلایا جائے کہ ہر پڑھا لکھا اس کو خود پڑھ لے اور کم از کم دس اَن پڑھوں کو پڑھ کر سنا دے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آمین۔

قومی ترانے

بلاشبہ پاکستان مسلمانوں کے لئے قدرت کا گراں قدر عطیہ ہے، اور مادرِ وطن کی ترقی و خوشحالی میں ہی ہماری بقا کا راز مضمر ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کی قومی سیاسی قیادت نے اس "کشورِ حسین" کو جس طرح تاخت و تاراج کیا وہ بھی تاریخ کا ایک المیہ ہے۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں نے اپنے اللّوں تللّوں سے "قوتِ اخوتِ عوام" کو انتہائی بے دردی سے مجروح کیا۔ ذیل میں پیش کئے جانے والے ترانے دراصل اسی المیے کا نوحہ ہیں۔ (ادارہ)

"پاک سرزمین شاد باد"

بج رہی ہے بین، شاد باد، میرے لال دین شاد باد
تیرا پان کتنا پُر بہار جانِ لالہ زار
تحفۂ حسین شاد باد

کتھا چونا چھالیہ قوام انسداد نزلہ و زکام
رنگ و بو کی مملکت جان من تابندہ باد
تیرا کیف حاصلِ مراد

حاملِ روایت قدیم مظہرِ عنایت عمیم
رہبرِ صراطِ مستقیم رحمتِ کریم
ارمغانِ جنتِ نعیم

مجید لاہوری مرحوم

مجید لاہوری

پاکستان ہمارا ہے

پاکستان ہمارا ہے، پاکستان ہمارا ہے
چمک چمک، پھٹ پھٹ، غرغروں
بھر بھر، پُھس پُھس، پوں پوں پوں
جھام جھما جھم، جھم جھوں
جھجر جھجر جھجر جان
پاکستان

پاکستان ہمارا ہے، پاکستان ہمارا ہے
ہم سندھی ہم مکرانی
ہم بلوچی ہم ملتانی
ہم کشمیری ہم پنجابی
ہم بنگالی! ہم پٹھان
وئی وئی وئی، ڈغ ڈغ ڈان
پاکستان

پاکستان ہمارا ہے، پاکستان ہمارا ہے
رستہ تیرا ٹانگ ہماری
کنگھ تیرا، مانگ ہماری
مینا تیرا، بانگ ہماری
تیری پگڑھی، میری شان
ٹاٹن ٹان ٹناٹن ٹان!
پاکستان

پاکستان ہمارا ہے، پاکستان ہمارا ہے

حضرت عینک فریمی

لوٹ مار چھین شاد باد

کھیت گھر زمین شاد باد کار بہترین شاد باد
پگڑیاں وزارتیں مکان کوٹھیاں، عمارتیں، دکان
لوٹ مار چھین شاد باد

بے وقوف لوگ ہیں عوام رہ گئے غلام کے غلام
کرسی، عہدہ سلطنت جوئندہ و پائندہ باد
لیڈروں کی منزل مراد

ہر طرف سفارشوں کا جال سرنگوں ترقی و کمال
پاک سرزمین میں حلال رشوتوں کا مال
رحمت خدائے ذوالجلال

چودھویں سالانہ سیرت النبی ﷺ کانفرنس

کارکنان احرار متوجہ ہوں:

تحریک تحفظ ختم نبوت (شعبۂ تبلیغ) مجلس احرار اسلام پاکستان کے زیر اہتمام ۱۲- ربیع الاول کو مسجد احرار ربوہ میں چودھویں سالانہ سیرت کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس موقع پر حسب سابق جلوس بھی نکالا جائے گا۔

مجلس احرار اسلام کی تمام شاخیں درج ذیل ہدایات کی روشنی میں کانفرنس کو کامیاب بنانے کی بھرپور تیاری شروع کر دیں۔ *کانفرنس میں شرکت کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دعوت دیں۔
*پروپیگنڈا مہم تیز تر کر دیں اور اپنے علاقے سے اخبارات کو مسلسل خبریں ارسال کریں۔
*کانفرنس میں شریک ہونے والے احباب کی تعداد سے مرکزی دفتر ملتان کو بروقت مطلع کریں
*ہر شاخ کم از کم بارہ جھنڈے ہمراہ لائے *ہر کارکن سرخ قمیض پہننے کا اہتمام کرے
*ہر قافلہ اپنا ایک امیر منتخب کرے اور اس کی اطاعت کرے *کانفرنس میں نظم و ضبط کا مکمل مظاہرہ کریں
مزید ہدایات بذریعہ سرکلر جلد ارسال کی جا رہی ہیں۔

والسلام
سید محمد کفیل بخاری
ناظم استقبالیہ سیرت کانفرنس دار بنی ہاشم- مہربان کالونی ملتان

پروفیسر محمد اکرام تائب
عارف والا

یومِ آزادی

بام پر سبز پرچم اُڑاتے ہیں ہم
جھنڈیوں سے گھروں کو سجاتے ہیں ہم
گاؤں، قصبوں سے شہروں کو جاتے ہیں ہم
جوش سے نعرے مل کے لگاتے ہیں ہم
حلف جاں دینے کا پھر اُٹھاتے ہیں ہم
یوم آزادی اک دن مناتے ہیں ہم

مُرغ، مچھلی، بٹیرے پکاتے ہیں ہم
تکے، شامی سموسے بناتے ہیں ہم
لڈو، برفی، جلیبی بھی لاتے ہیں ہم
اپنے معمول سے بڑھ کے کھاتے ہیں ہم
کھا کے بوتل پہ بوتل چڑھاتے ہیں ہم
یوم آزادی اک دن مناتے ہیں ہم

یوں مسرت کا کرتے ہیں اظہار ہم
"ویڈیو" لاؤ کرتے ہیں اصرار ہم
ہم جواروں کو کرتے ہیں بیزار ہم
سونے والوں کو کرتے ہیں بیدار ہم
فلم بچوں کو شب بھر دکھاتے ہیں ہم
یومِ آزادی اک دن مناتے ہیں ہم

آب احمر بھی پیتے ہیں کچھ نوجواں
جگمگا اُٹھتے ہیں کچھ یہاں خاکداں
مسکرا کر لٹا کر غم دو جہاں
بھول کر تلخ ماضی کی سب داستاں

جھومتے ناچتے گیت گاتے ہیں ہم
یوم آزادی اک دن مناتے ہیں ہم

قتل و غارت ہوئی خوں کے دریا بہے
عصمتیں لٹ گئیں دیکھتے ہم رہے
غیر ہم پہ لگاتے رہے قہقہے
بے گناہوں نے کتنے مظالم سہے

تلخ باتیں سبھی بھول جاتے ہیں ہم
یوم آزادی اک دن مناتے ہیں ہم

آگ ہی آگ کا ایک طوفان تھا
ہر ستم کا نشانہ مسلمان تھا
یہ پس پردہ افرنگی شیطان تھا
سکھ وحشی درندہ جو حیوان تھا

اب اسے بھی گلے سے لگاتے ہیں ہم
یوم آزادی اک دن مناتے ہیں ہم

ہاتھ سے جانے دینا نہ کشمیر کو
پھاڑ دو آج ہی دام تزویر کو
توڑ ڈالو سہاروں کی زنجیر کو
خود بدلنا ہے ماتھے کی تحریر کو

غیر کے در پہ کیوں سر جھکاتے ہیں ہم
یوم آزادی اک دن مناتے ہیں ہم

خالد شبیر احمد

غزل

رقم ہیں لوحِ جہاں پر حکائتیں اپنی
مثالِ نور ہیں روشن صداقتیں اپنی
ہیں دیں کی گرمی سے دائم تمازتیں دل کی
اسی کے نام ہیں ساری حرارتیں اپنی
سیاہ رات ہے ڈوبے ہیں سب اندھیرے میں
چراغِ راہِ سفر ہیں جسارتیں اپنی
رہا ہے غُلغلہ دورِ فرنگ میں اپنا
کہ معتبر ہیں جہاں میں بغاوتیں اپنی
فضائے فقر میں پائی ہے پرورش ہم نے
ہیں زندہ آج جنوں سے رفاقتیں اپنی
میں ناامید نہیں ہوں خدا کی رحمت سے
پلٹ کے آئیں گی اک دن وہ **راحتیں** اپنی
چمن گواہ ہے خالد میری فصاحت کا
فضا میں پھیل گئیں ہیں بلاغتیں اپنی

○ ○

اسلام کے نامور سپوت، تحریک آزادی کے عظیم مجاہد، فدائے احرار

مولانا محمد گل شیر شہیدؒ

سوانح وافکار، احوال وآثار، سیرت وکردار، اور بچپن سے شہادت تک بے مثال جدوجہد۔ نوجوان محقق محمد عمر فاروق کے قلم سے ——— ایک تاریخی دستاویز۔ مقدمہ نگار، حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ، مولانا سید عطاء المحسن بخاری مدظلہ، ڈاکٹر انور سدید، مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی، فلیپ۔ احمد ندیم قاسمی، مولانا محمد اسحٰق بھٹی۔ نایاب اخباری وسرکاری ریکارڈ سے ماخوذ دستاویزات شائع ہوچکی ہیں؛

- حضرت مولانا گل شیر شہیدؒ کے حوالے سے قلم اٹھانا محمد عمر فاروق کی خوش نصیبی بھی ہے اور ان کی قابلِ داد محنت وستائش کا ثبوت بھی (احمد ندیم قاسمی)
- یہ کتاب مولانا گل شیر شہیدؒ کی عظمت وعظیمت کے کارناموں کا دلچسپ مرقع ہے۔ اس کا مطالعہ عہد رفتہ سے کامل آگاہی کا ضامن ہے۔ (مولانا محمد اسحٰق بھٹی)
- کتاب میں مولانا کی شخصیت کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے، کتاب قاری کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ اور اس کا اسلوبِ نگارش دورِ حاضر کے تمام تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

(سید عطاء المحسن بخاری مدظلہ)

- مولانا محمد گل شیر شہیدؒ ایک زندہ وبامقصد کتاب اور حضرت شہیدؒ کا ایک مبسوط ومفصل، اور جاندار تذکرہ ہے۔ (مولانا سعید الرحمٰن علوی)

صفحات ۴۰۲، کمپیوٹر کتابت، اعلیٰ طباعت، خوبصورت سرورق، مجلد قیمت ۱۰۰/ پیشگی رقم ارسال کرنے والے احباب خصوصی رعایت پر صرف ۸۵/۰۰ روپے میں حاصل کریں۔ مصارف ڈاک بذمہ ادارہ ؛

بخاری اکیڈمی — دارِ بنی ہاشم، مہربان کالونی ملتان

جامِ شیریں
خالص اجزاء۔بہتر شربت
ملک کا واحد شربت جس کی تیاری میں پانی کا ایک قطرہ بھی شامل نہیں۔
عام شربت میں پانی اور مصنوعی اجزاء استعمال ہوتے ہیں جبکہ قرشی کے جامِ شیریں میں خالص اجزاء کے عرقیات استعمال کیے جاتے ہیں۔
خالص اجزاء کے عرقیات کے استعمال کی وجہ سے اس کا ذائقہ منفرد ہے۔ پینے سے طبیعت بھی بھاری نہیں ہوتی اور دوسرے شربتوں کے مقابلے میں یہ پیاس بڑھاتا نہیں بلکہ پیاس بجھاتا ہے۔ جامِ شیریں گرمیوں میں لُو سے بچاتا ہے تسکین بخشتا ہے اور مفرحِ قلب ہے۔
جامِ شیریں کی ایک بوتل سے بغیر چینی ملائے ۳۰ گلاس شربت بنایا جا سکتا ہے۔
قرشی کا جامِ شیریں خالص اجزاء۔بہتر شربت
شربت
جامِ شیریں
قرشی
تحقیق کی روایت۔معیار کی ضمانت

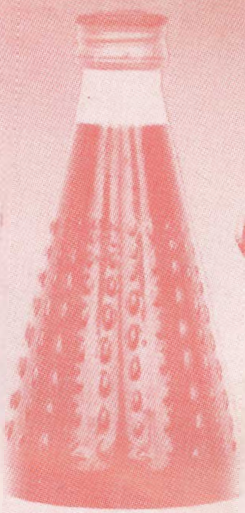

MONTHLY © 72813
NAQEEB-E-KHATM-E-NUBUWWAT
Regd No. L - 8755 MULTAN

Vol. 3 No. 8

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي

جامع مسجد ختمِ نبوّت

دارِ بنی ہاشم — مہربان کالونی — ملتان

زیرِ اہتمام : تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت (شعبۂ تبلیغ) عالمی مجلس احرارِ اسلام پاکستان

مسجد کی چھت مکمل ہو چکی ہے، بقیہ تعمیر کی تکمیل میں بھرپور حصہ
لیں، نقد یا سامان تعمیر دونوں صورتوں میں تعاون فرمائیں

— ترسیل زر کے لئے —

ابن امیر شریعت سیّد عطاء المحسن بخاری
دار بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان
اکاؤنٹ نمبر ۲۹۹۳۲ حبیب بنک حسین آگاہی ملتان